ہماری آزادی کی کہانی

۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ

۱۸۵۷ کا سیاسی پس منظر

حقیقت یہ ہے کہ

ہندوستان میں جتنی بھی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں وہ تمام کی تمام شخصی حکومتیں تھیں ۔ اسلئے وہ جلد جلد مٹتی رہیں ۔ عوام اور حکومت میں کوئی ایسا ربط قائم نہ ہوا جس کی وجہ سے کوئی مستقل اور مضبوط نظام ظہور میں آتا اور روز روز کے انقلابات اور جنگ و جدل سے نجات مل جاتی ۔ مغلوں کی حکومت کا مرکزی کردار اکبر اعظم ہے مگر اسکی حکومت بھی اپنے اندر زوال کے اسباب لئے ہوئے تھی ۔ چنانچہ اورنگ زیب کی مجاہدانہ زندگی کے باوجود اسکی موت کے فوراً بعد ہی مغلوں کی حکومت کٹھ پتلی کا تماشہ بن گئی ۔

۱۸۵۷ میں کیفیت یہ تھی کہ شہنشاہ کی حکومت قلعہ معلیٰ اور آردو بازار کے دس پندرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی ۔ تمام ملک میں یا انگریزوں کا قبضہ تھا یا مختلف ریاستیں تھیں جو اپنے اندر اتنی قوت نہ رکھتی تھیں کہ انفرادی یا اجتماعی طور پر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو روک سکیں ۔

غدر (جنگ آزادی) ہندوستانی عوام کے ایک مختصر طبقے کی پہلی کوشش تھی کہ وہ اپنے قوت بازو سے غیروں کے چنگل سے ہندوستان کو آزاد کرائیں ۔

۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ

سلسلہ تاریخ انقلاب

ہماری آزادی کی کہانی

۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ

مؤلفہ

عشرت رحمانی

ناشران

مکتبہ معین الادب۔ اردو بازار۔ لاہور

تاریخِ اشاعت : جنوری ۱۹۵۸ء

طبع : اوّل

مطبع : اِنشاء پریس لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت : دو روپے

فہرستِ مطالب

تمہید

"ابتدا ہوتی ہے تیرے نام سے"

اس برِّ صغیر پر انگریزوں نے قبضہ کر کے جب ملکِ ہند اور ساری قوم کو غلام بنایا تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کا علمی اور تاریخی سرمایہ غارت کر ڈالا۔ تاریخِ ہند کے صفحات کو اس طرح مسخ کر دیا کہ ہماری نئی پود تحقیق کی شاہراہ سے بھٹک گئی۔ ہمارے اسلاف کے کارناموں کو اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ ہمیں ان سے صحیح واقفیت تو کیا محبت یا ہمدردی کی جگہ نفرت ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "برطانوی تسلط سے پہلے ہم ایک صحیح اور صحت مند علمی روایت کے مالک تھے۔ علمی مباحث میں رواداری ہمارا شیوہ تھا اور فنِ تاریخ نویسی میں ہم خصوصیت سے اس کے پابند تھے کہ حقیقت نگاری اور صداقت سے کبھی پہلو تہی نہ کریں"۔ لیکن برطانوی حکمرانوں نے اپنی بد دیانتی کا پہلا وار (جس کو وہ دور اندیشی اور مصلحت بینی سے تعبیر کرتے ہیں) یہ کیا کہ ہمارے کتب خانے برباد کر دئے۔

ہماری خانہ ویرانی کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب وتمدن کے تابندہ نشانات بھی رفتہ رفتہ مٹا ڈالے۔ ہمارے علمی خزانے جن میں صدیوں کا جمع شدہ سرمایہ تھا انگلستان بھیج کر مقفل کر دئے گئے۔ تاکہ ہم اپنی روایات سے بے خبر ہو جائیں۔ اور پھر منظم طور پر ہماری ملکی تاریخ سرے سے بدل کر اس انداز میں پیش کی جانے لگی۔ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق اور نفرت کی خلیج پیدا ہو جائے۔ مسلمان سلاطین کو ظالم، ناانصاف اور جابر و عیاش ظاہر کر کے آئندہ نسلوں کے دماغوں میں ایسا زہر گھولا گیا کہ وہ اپنے تمدن و قومی روایات پر فخر کرنے کی جگہ باعثِ ننگ و عار سمجھنے لگیں۔ اور نئے حکمرانوں کی عقل و دانش، سیاست و انصاف اور احسانات کے معترف ہو جائیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس برّ صغیر میں اپنے عیارانہ قدم جمائے اور تجارت کو مکر و فریب سے ضرب دے کر اس کا حاصل ضرب حکومت نکالا تو اسی عہد سے اس مصلحت کے ماتحت ملک میں فرقہ پرستی اور قوم میں باہمی نفرت پھیلانے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی۔

سب سے زیادہ اسلامی عہد کی تاریخ ہند برطانوی حکمرانوں کی نظروں میں کانٹا بن کر کھٹکتی تھی۔ چنانچہ سر چارلس ایلیٹ نے "مورخین کی تاریخ ہند" کے نام سے اپنی رسوائے عالم کتاب لکھی۔ جو ۱۸۵۶ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ اس میں نہایت ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے مسلمان بادشاہوں کو طرح طرح سے بدنام ثابت کرنے کی کوشش

کی۔ اس کتاب کا ہر باب جس کو تاریخ کے نام سے منسوب کرنا ناانصافی اور غلط بیانی ہے۔ ذلت کی ایک بے سر وپا داستان ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کی تدوین میں اس بددیانت انگریز موئف نے خود کوئی زحمت بھی برداشت نہیں کی بلکہ مسلمان فضلاء عصر سے مواد فراہم کرا کے اپنے "سیاسی وقومی" نقطۂ نظر کے ماتحت ضروری ترمیم وتنسیخ کے بعد مرتب کر لیا۔ سب سے زیادہ کام نواب ضیاء الدین خان نیرؔ ورخشاں اور سرسید احمد خان کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ لیکن ان کی تمام جانفشانی اور کاوشوں کا یہ صلہ دیا کہ تمام واقعات وحالات کو مسخ کر کے صرف ایک دیباچہ کے اضافہ کے ساتھ ان کی خدمات کا حوالہ دیئے بغیر کتاب اپنے نام سے شائع کر دی۔ اس کے بعد جتنی کتابیں تاریخ ہند کے سلسلہ میں مرتب کی گئی۔ سب اسی نقطۂ نظر کے تحت تھیں۔ اور مسلمان سلاطین کی شان میں ایک ہی مطمح نظر تھا کہ

ع

"عالمگیر ہندوکش تھا ظالم تھا ستمگر تھا"

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کی سیاسی اغراض اس سے بدرجۂ اتم پوری ہوئیں۔ اور انہوں نے اپنی حکومت کا نقش جمانے میں پوری کامیابی حاصل کی۔ اس کے علاوہ بھی جو کچھ کیا گیا وہ ایک طویل داستانِ حکمت وسیاست ہے جس کا ذکر ان صفحات میں بے محل ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہماری تاریخی روایات اور فنِ تاریخ کی بنیادوں کو تباہ کرنے میں انگریزوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے دولت کے

زور اور حکومت کے جبر سے ہمارے ملکی مورخوں کے قلم پر بھی مہریں لگا دیں، نیز ان کے قلم سے ایسی تاریخیں مرتب کرائیں جنہوں نے غیر ملکی مؤلفین کی بد دیانتی کو بھی مات کر دیا۔ کیونکہ انگریز چاہتے تھے کہ اس برّصغیر کی نئی پود یہ تاریخیں پڑھ کر مغالطہ میں آسانی سے مبتلا ہو جائے۔ اور یہ سمجھ کر ان کی صحت پر شک نہ کرے کہ یہ ہمارے ہی ہم قوم اصحاب نے مرتب کی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ جب تک برطانوی تسلّط رہا ہم اس کے راگ گاتے رہے۔ اور جب کہ پاکستان اور ہندوستان میں دونوں جگہ قومی اور ملکی حکومت قائم ہے۔ اور دونوں ملک آزاد ہیں ہمارے ذہن انگریزی اثرات ونقوش سے خالی نہیں۔

ہمارے سامنے جو اپنا ملکی تاریخی سرمایہ ہے ہم اسی کو مستند سمجھنے پر مجبور ہیں حالانکہ ہمیں اس کا بخوبی علم ہے کہ یہ اغیار کے مسموم اثرات کے ماتحت مرتب ہوا ہے۔ لیکن چونکہ برطانوی حکمرانوں نے اپنی حکمت وتدبیر سے فن تاریخ اور ماخذ ہی مسخ کر کے رکھ دئیے اس لئے اب بھی ہمارے انشا پرداز اور مورخین اپنے ملکی تمدّن وتاریخ کو اسی روشنی میں دیکھنے کے لئے مجبور اور عادی ہیں۔

افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ آج ہم اپنی مملکت آزاد میں مسلمان سلاطین کی تاریخ اور جنگ آزادی کی جدّوجہد کی تفصیل آزاد خیالی اور آزاد کاوش وفکر سے مرتب نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اشد ضرورت ہے کہ اپنے گم شدہ سرمایہ کو اپنی چھنی ہوئی آزادی کی طرح واپس لیں اور اس کے تحفظ وتابندگی

کا درست اہتمام کریں۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو تاریخ کے سائنٹیفک اصولوں پر غور و تدبّر کے ساتھ پرکھیں۔ اور ان کی عزیمت و عظمت کی داستانوں کو محفوظ کریں۔ تاکہ ہمارا علمی، عملی اور تمدّنی سرمایہ تعصّب و خود غرضی کے گرد و غبار سے پاک و صاف ہو کر منصّۂ شہود پر متجلّی ہو۔ اور ہماری آئندہ نسلیں اپنے ماضی کی درخشانی سے مستفید ہو کر اپنے قومی و ملکی مستقبل کو تابناک بنائیں۔

یہ تاریخی سلسلہ "ہماری آزادی کی کہانی"، اسی مقصد کے ماتحت، ترتیب دیا گیا ہے۔ متعدد انگریزی، اردو اور فارسی کی مستند مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب و دستاویزات کی مدد سے کام لے کر جدید تاریخی فن کی روشنی میں بے حد کاوش و محنت کے ساتھ تمام حالات و واقعات کی صحت و سند کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا ہر حصہ اپنی جگہ ایک مخصوص شعبہ یا ہماری جدوجہد آزادی کے کسی موضوع سے متعلق اس کی تفصیلات پر حاوی اور بجائے خود مکمل تاریخی دستاویز ہے۔ اس سلسلۂ تاریخ کی ترتیب کی حقیقی غرض و غایت یہ ہے کہ ہماری ملکی و تمدنی تاریخ کے بارے میں اغیار یا منافقین اور ملک کے غدّاروں نے جو غلط فہمیاں اور بے بنیاد افترا پردازیاں پھیلا رکھی ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ اور ہمارے آزاد نونہال اپنی مسلم الثبوت ملّی و ملکی داستانِ حیات سے آزادانہ طور پر روشناس ہو سکیں۔

قیام پاکستان سے پہلے غلامی کے دور میں غیر ملکی تسلط نے ہمارے

اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کے لئے جو نصاب مرتب کرائے اور رائج کئے ان کا مقصد وہی تھا جو کسی غیر قوم کے فاتح کا اپنی زیر عنان غلام قوم کے حق میں ناروا رویہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ خصوصاً تاریخ کی درسی کتابوں کی ترتیب میں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا کہ ہم انگریزوں کو اپنا محسن حکمران سمجھیں اور ان کی خوبیوں اور نیکیوں کو غنیمت جان کر ان کی صفت کے راگ گائیں۔ اور اپنے سلاطین کے مسخ کردار سے نفرت کریں۔ جو انگریز حکمرانوں کے دماغوں ہی کے اختراع کئے ہوئے تھے۔

ہماری جنگِ آزادی ۱۰ ؍مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوئی۔ قوم و ملک کے مجاہدین، علماء، فضلاء اور شیر دل بہادروں نے عزم و عمل شجاعت و استقامت کے بے مثال کارنامے انجام دئے۔ لیکن قوم و وطن کے غداروں نے ان کی تمام قربانیوں اور مساعی کو ملیامیٹ کر کے برطانوی اقتدار کو ملک پر مسلط کر لیا۔ قوم غلام ہو گئی اور "یہ جنگِ آزادی" "غدر" کے نام سے مشہور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ آج دورِ آزادی میں بھی ہمارے بعض "تعلیم یافتہ جاہل" اس جہاد کو "غدر" ہی کہتے ہیں۔ یہ سب غیر ملکی اقتدار کے پروپیگنڈے کا اثر ہے اور اسی شر و فساد کو دور کرنے کی خاطر یہ سلسلۂ کتب پیش کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ ناواقف یا کم علم دماغ "غدر" اور "جہاد آزادی" کے فرق کو سمجھ سکیں گے۔ اور واقعات کی مجلّا روشنی میں اندازہ کر سکیں گے۔ کہ مملکت پاکستان کا مبارک قیام ہماری اس جد و جہد کا نتیجہ اور ہمارے

اکابرین کی قربانیوں کا خون بہا ہے جس کا بیج ۱۸۵۷ء میں بویا گیا۔ الحمدللہ کہ اب ہم آزاد ہیں اور آزادی کے ساتھ اپنی تاریخی عظمتوں کو محسوس کر کے ان کو بلند و بالا اور تاباں و درخشاں کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

یہ کتابچہ اس سلسلہ کا آغاز ہے۔ جس میں ۱۸۵۷ء کی عوامی جدوجہد کے اسباب و عوامل کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اور کمپنی کی صد سالہ حکومت کا مختصر خاکہ۔ جس نے برّ صغیر پر مسلّط ہو کر اس کی آزادی۔ قومی شعار، تہذیب و تمدّن اور دولت و اطمینان و فراغت سب کچھ لوٹ لیا۔

ملک کے مسلمان رہنماؤں نے حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مجاہدین۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء و معتقدین کی سرکردگی میں انقلابی تحریک کا آغاز اور عہد بہ عہد تنظیم کی۔ تاکہ غیر مسلم اقتدار اور غیر ملکی تشدد و تسلط سے ملک و قوم کو چھڑائیں۔ رفتہ رفتہ اس تنظیم نے قومی اتحاد کی صورت اختیار کی اور غیر ملکی جبر و سختی نے ایسے حالات رونما کر دئے جس کے تحت غیر اسلامی اور غیر انسانی معاشرہ کی بنیاد پڑتی نظر آئی۔ آخر کار متحدہ ہندوستان میں "عوامی انقلاب" برپا ہو کر رہا۔

صورتِ حالات ناسازگار تھی۔ انجام ناکامی ہوا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے ایک بار یہ ثابت کر دیا کہ غیر تمند ہندوستان کے عوام اپنے قومی شعائر کی بربادی کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتے۔ اس کے تحفظ کی خاطر انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہی مختصر داستان اس کتابچہ میں درج ہے۔ جس کی صداقت پر ان غیر جانبدار مستند مورخین کی مہریں

ثبت ہیں۔ جنہوں نے مخالفین کی ہر ممکن سعی کے باوجود حق گوئی سے کام لے کر رازِ درونِ پردہ کو بے نقاب کیا۔

اس کتابچہ میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ تاکہ ہر عام و خاص خصوصاً ہمارے نوجوان طبقہ کو آسانی سے کم وقت میں مطالعہ کا موقعہ مل سکے۔ لیکن حالات کی صحت و سالمیت مستند ہے جنکی ترتیب میں بے شمار اہم دستاویزات و تواریخی کتب کے ذخائر سے مدد لی گئی ہے۔ اختصار میں جامعیت کو پورا دخل ہے۔ اور بعض تفصیلات ایسی بھی شامل کی گئی ہیں۔ جو اس سے پہلے کسی ضخیم کتاب میں (اُردو زبان میں) یکجا نہیں ہوئیں اس لحاظ سے اس ناچیز اور مختصر پیش کش کو اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تصور کیا جائے گا۔

والسلام

عشرت رحمانی

عروج اور فارغ البالی کا دور

مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں اس برصغیر (پاک وہند) نے نہایت شان وشوکت، عقل وحکمت اور تدبر وانصاف کے ساتھ سالہا سال حکومت کی۔ اسلامی ہند کی سلطنت کا یہ دور بہت شاندار رہا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں خوش حالی اور فارغ البالی تھی۔ علم وفن کی ترقی تھی اور تمام فرقے میل جول کے ساتھ سکون واطمینان کی زندگی بسر کرتے نظر آتے۔

عظمت اور فراغت کا یہ زمانہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تک رہا۔

کمال کے بعد

۳ مارچ ۱۷۰۳ء کو شہنشاہ عالمگیر نے وفات پائی۔ آخری وقت میں اُس نے بیٹوں کو وصیت کی کہ صلح صفائی اور خوش دلی کے ساتھ سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کر لینا۔ کیونکہ اُس نے شہزادوں کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا اندازہ اور ملک کے سیاسی حالات کا صحیح جائزہ کر لیا تھا۔ اور اس کی یہ نصیحت نہایت مناسب تھی۔ بڑھتی ہوئی مخالفانہ قوتیں چاروں طرف سے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے سر اٹھا رہی

تھیں ۔ اس لئے کسی ایک مقام سے ان کا مقابلہ کرکے ان کو کچلنا ممکن نہ تھا۔ بلکہ تین حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد کئی محاذ بناکر آسانی سے اُن کو دبایا جا سکتا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے جانشینوں میں اتنی سوجھ بُوجھ اور عقل وجرأت نہ تھی انہوں نے شہنشاہ کی وصیت پر عمل نہیں کیا۔ برخلاف اس کے آپس میں لڑائی جھگڑے شروع کردئے۔ جو قوت دشمن کا مقابلہ کرنے میں صرف ہونی چاہیئے وہ آپس ہی میں لڑکر ختم ہوتی گئی ۔

رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت کمزور ہونے لگی۔ اور آخرکار جس سلطنت کا پھیلاؤ کشمیر سے دکن تک اور بنگال سے کابل اور قندہار تک دیکھنے میں آتا تھا وہ محدود ہوکر دلّی کے لال قلعہ کی چار دیواری میں باقی رہ گئی۔ ملک کے تمام صوبیداروں نے مرکز کی طاقت کو کمزور دیکھ کر سر اٹھایا۔ اودھ میں نواب سعادت علی خان، بنگال میں علی وبردی خان اور دکن میں نظام الملک قوت پکڑتے گئے۔ انہوں نے ان علاقوں میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی عمارت الگ الگ بنالی ۔

مسلمانوں کی قوت کو مرکز سے ہٹتے اور ٹکڑوں میں بٹتے دیکھ کر غیر فرقوں کی طاقتوں نے موقعہ غنیمت دیکھا۔ سکھ، مرہٹے، جاٹ سب اپنی اپنی جگہ ہنگامے اور فساد برپا کرنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کو روز بروز زوال نصیب ہوتا گیا۔ ملکی حالات خراب ہوتے گئے۔ امن واطمینان کی جگہ خانہ جنگی اور خوشحالی وفراغت کی جگہ فتنہ وفساد نے لے لی۔ آپس کے جھگڑے، دشمنی نفرت اور لوٹ مار عام ہوتی گئی ۔ سارے ملک میں پھوٹ

پڑ گئی۔

انگریز تجارتی کمپنی کے روپ میں مدتوں سے ملک میں آئے بیٹھے تھے۔ اور نئے نئے جال بچھا کر حکمران بننے کے لئے موقعہ کے منتظر تھے۔ انہوں نے ایسی چالیں شروع کیں کہ آپس کے جھگڑے اور زیادہ بڑھ گئے۔ جو ملکی طاقتیں کمزور ہوئیں ان کے علاقوں پر حفاظت کرنے کے بہانے سے انگریزوں نے قبضہ جمالیا۔

انگریز تاجر

انگریزوں کی تجارت اور برّصغیر میں آمد کیسے شروع ہوئی؟ اور اور انہوں نے معمولی کاروبار کے ذریعے کُل ہند کا کس طرح سودا کیا؟ یہ کہانی بہت عجیب اور دردناک ہے۔ مختصر طور پر اس کا حال یہ ہے:۔

"انگریز مختصر تجارتی جماعت کی صورت میں ۱۶۰۰ء میں سند لیکر ہندوستان آئے۔ اور اس سند کی مدت ختم ہونے کے بعد یہیں رہنے کی اجازت حاصل کرلی۔ بعد ازاں چند اور جماعتیں بھی کاروبار کی غرض سے آئیں اور تجارت کا یہ سلسلہ ۱۶۹۳ء تک خاصہ ترقی کر گیا۔ کچھ عرصہ بعد دو کمپنیاں کاروباری سرگرمیوں میں مصروف ہو کر آپس میں مخالفت پر آمادہ ہوگئیں. لیکن ۱۷۰۸ء میں دونوں متفق ہو کر یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے متحدہ شکل میں کام کرنے لگیں۔ ۱۶۱۲ء میں شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے عہد میں اجازت حاصل کر کے سوداگران کمپنی نے احمد آباد۔ سورت

اور بمبئی میں اپنے تجارتی مرکز اور چند کارخانے بنائے۔ مدراس کے راجہ سے اجازت لے کر مدراس میں سینٹ جارج کے نام سے قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۶۶۸ء میں شاہ انگلستان چارلس دوم کی شادی شاہ پرتگال کی بیٹی کیتھرائن سے ہوئی تو شاہِ پرتگال نے اپنی بیٹی کے جہیز میں شاہِ انگلستان کو ایک جزیرہ دیا۔ اس زمانہ میں ڈچ لوگوں نے تجارت کی جگہ ہندوستان میں زمین اور جاگیریں خرید کی تھیں جن سے ان کی بڑی شہرت تھی۔ انگریزی کمپنی نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی ناموری کے خیال سے بادشاہ فرخ سیر کے باپ شہزادہ عظیم الشان ابن عالمگیر سے جو ان دنوں بنگال کا صوبیدار تھا اور روپیہ کا حاجت مند۔ کلکتہ میں اور اس کے گرد و نواح میں کچھ زمینیں خرید کر کوٹھیاں بنالیں۔ اس طرح ان کی جائداد بھی تیار ہو گئی۔ اب چندر نگر میں فرانسیسیوں کی کوٹھی تھی۔ کلکتہ میں انگریزوں کی اور جزیرہ میں ڈچ کی۔ اور یہ تینوں کوٹھیاں دریائے ہگلی کے کنارے واقع تھیں۔ ان کمپنیوں کے کاروباری سلسلے جاری رہے انگریز برابر اپنے تعلقات ہندوستان سے زیادہ گہرے کرنے کی فکر میں لگے رہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۷۱۵ء میں یونائیٹڈ السیٹ انڈیا کمپنی کے حق میں مزید رعائتیں مانگنے کی غرض سے شاہ فرخ سیر کے دربار میں اپنا ایک وفد بھیجا۔ ایک سفیر بھاری تحفے لے کر ڈاکٹر ہملٹن نامی کی معیت میں حاضر دربار ہوا۔ ڈاکٹر انگریزی فنِ طب میں بڑا ماہر اور ہوشیار تھا۔ اس زمانہ میں شاہ فرخ سیر سخت علیل تھا اور اس کی

شادی جو مہاراجہ جودھپور کی صاحبزادی سے ہونا قرار پائی تھی بادشاہ کو اس شادی کا بیحد اشتیاق تھا اور وہ صحت پانے کے لئے سخت بیچین تھا تاکہ شادی میں التوا نہ ہو۔

دربار ی طبیب بادشاہ کے معالجہ سے عاجز آچکے تھے۔ ڈاکٹر ہملٹن کو بادشاہ کی بیماری کا حال معلوم ہؤا تو اُس نے علاج کی درخواست کی جو بصد شوق منظور کی گئی۔ ڈاکٹر کے علاج سے بادشاہ کو جلد صحت ہوگئی۔ اس پر بادشاہ نے خوش ہوکر ڈاکٹر سے کہا کہ "ہم تمہاری خدمات کے عوض منہ مانگا انعام دینا چاہتے ہیں۔ مانگو کیا مانگتے ہو"۔ انگریز ڈاکٹر کے دل میں اس وقت ذاتی غرض کے عوض اپنی قوم اور ملک کی بہبودی اور مفاد کا خیال آیا۔ اور اُس نے اپنے لئے انعام واکرام طلب کرنے کے بدلے عرض کی کہ :-

"عالی جاہ! میرے ہم قوم جو آپ کی سرزمین میں تجارت کرتے ہیں ان کے لئے میری التجا ہے کہ ان کے تجارتی سامان کا محصول معاف کر دیا جائے اور کچھ زمینیں مرحمت ہوجائیں تاکہ وہ اپنی رہائش اور دفاتر کے لئے عمارتیں بنا کر اطمینان سے کاروبار کر سکیں اور ان کی حفاظت کے لئے کچھ سپاہی بھی رکھنے کی اجازت عطا ہو۔" بادشاہ نے حسب وعدہ ڈاکٹر کی درخواست منظور کر لی۔ اور انگریزی کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کے نام سے ایک عالیشان قلعہ تعمیر کرالیا۔ اور انگلستان سے مختصر گورا پلٹن طلب کر کے تعینات کر لی۔ جس میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے گئے۔ اور زمینداری بھی بڑھاتے رہے۔

اسی زمانہ فرانسیسی لوگ پانڈیچیری پر قابض تھے۔ ان کا گورنر ڈیوپلے سیاسی تورجوڑ میں مصروف فرانسیسی اقتدار بڑھانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ نظام الملک کے پوتے مظفر جنگ کو صوبہ دکن کا حاکم بنائے اور حیدر علی کو کرناٹک کا۔ تاکہ ان کا تعاون حاصل کر کے انگریزوں کے مقابلہ میں اپنی قوت بڑھا سکے۔ انگریزوں نے اس سیاسی چال کو بھانپ کر ایسی حکمتِ عملی سے کام لیا کہ نظام الملک کے بیٹے ناصر جنگ اور حیدر علی کو اپنا ساتھی بنا لیا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان معرکے ہوئے۔ جن میں شکست فرانسیسیوں کو ہوئی۔ انگریز فتحیاب ہو کر فرانسیسیوں کے تجارتی مرکزوں پر بھی قابض ہو گئے۔ بعد ازاں انگریزی کمپنی نے اپنا اثر و رسوخ اور قوت بڑھانے کی مسلسل کوشش جاری رکھی۔ اٹھارویں صدی میں انگریز تاجروں کی طاقت خاصی بڑھ چکی تھی۔

بیرونی حملے

اٹھارویں صدی ہندوستان کے حق میں نہایت منحوس ثابت ہوئی اس زمانہ میں ملک کی اندرونی سازشوں اور خانہ جنگیوں کے علاوہ سب سے زیادہ تباہ کن ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ تھا۔ جس سے شمالی ہند کے لوگ خصوصاً اہلِ دہلی ایسے مصائب کا شکار ہوئے کہ پھر کبھی پنپ نہ سکے۔ اور مغلیہ سلطنت کے ضعف میں بھی زیادہ اضافہ ہوتا گیا جس کو دیکھ کر اندرونی قوتوں۔ (سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں) نے کھلّم کھلا دہلی پر حملے شروع کر دیئے، اب

مغل حکمرانوں کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے لگا۔ اور سیاسی بدامنی کے ساتھ معاشی بدحالی بڑھتی گئی۔ اس صورتِ حال کو انگریز نہایت غور و خوض سے دیکھ رہے تھے۔ اور موقعہ کی تاک میں اپنے اقتدار کے منصوبے اور سازشیں تیار کر رہے تھے۔ ادھر احمد شاہ ابدالی کے حملے نے بھی مغلوں کی طاقت پر کاری ضرب لگائی اور اسطرح بیرونی حملوں نے یکے بعد دیگرے مغلیہ سلطنت کے تابوت میں کیلیں ٹھونکیں۔ اور دشمنوں کے ہاتھوں کو مضبوط کیا۔ جس جس کو موقعہ ملا وہ دہلی کی طرف چڑھ دوڑا۔

آخر کار مرہٹوں نے دہلی پر قبضہ کر کے ۱۷۷۱ء میں نابینا مغلیہ تاجدار شاہ عالم ابن عالمگیر ثانی کو اپنا وظیفہ خوار بنا کر لال قلعہ میں محصور اختیارات سے معذور بے دست و پائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ مختلف علاقوں میں نوابوں اور راجوں کو جہاں جہاں موقعے ملے انہوں نے سر اٹھایا اور قابض بن بیٹھے۔ مرکزی حکومت شکستہ تھی۔ ساری سلطنت کے حصے بخرے تقسیم ہو رہے تھے۔

شیرِ بنگال جنگ پلاسی

اس سے پہلے سے انگریزوں کی طاقت مختلف علاقوں میں بڑھتی رہی تھی۔ اور وہ برابر ملک گیری کی ہوس میں طرح طرح کی سازشیں کر رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر بنگال میں غازی نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو ختم کرنے کا تہیہ کیا۔ لارڈ کلایو اور سراج الدولہ

کے درمیان بنگال کے محاذ پہ خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ لیکن سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر نے وطن دشمنی اور غداری کا ثبوت دیا۔ اُس نے انگریزوں سے ساز باز کر لیا اور ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیاں پلاسی کے میدان میں آخری معرکہ کے دوران میر جعفر کی سازش سے انگریز فتحیاب ہو گئے۔

سراج الدولہ کی اس شکست سے بنگال میں انگریزوں کا اعلیٰ اقتدار قائم ہو گیا۔ اور اس سے انگریزی کمپنی کو اپنے حکمرانی کے منصوبوں کو زیادہ قوت دینے میں مدد ملی۔ اگر ۱۷۵۷ء کی جنگ میں غداری اور سازش نہ ہوتی تو شیر دل نواب انگریزوں کو ملک سے نکال دینے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور انگریزوں کی ملک گیری کی ہوس ختم ہو جاتی۔

دراصل ۱۷۵۷ء کی جنگ ہندوستان کی آزادی و غلامی کے فیصلہ کا سب سے اہم معرکہ اور فتح و شکست کا پہلا موڑ تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے تجارت کی جگہ اب ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے جگہ جگہ اپنی سازش اور قوت کے جال پھیلانے شروع کر دئے۔

حیدر علیؒ اور سلطان شہیدؒ

بنگال کے بعد دکن کی باری تھی۔ سراج الدولہ کے بعد حیدر علی نے فرنگی خطرے کے بڑھتے ہوئے طوفان کا احساس کیا اور ملک کو اس سے نجات دلانے کی جدوجہد شروع کی۔ اور انگریزوں کے اتحاد سے اپنے کو علیحدہ کر کے

اعلان جہاد کیا۔ انگریزوں نے قدیم عیاری سے کام لے کر مرہٹوں اور نظام دکن کو اپنے ساتھ ملایا اور میسور پر حملہ کرا دیا، حیدر علی فرنگی سازش سے بخوبی واقف اور نہایت مدبر و اولعزم مجاہد تھا اسنے مرہٹوں اور نظام کو انگریزوں سے جدا کر دیا۔ انگریز اس سے بہت گھبرائے۔ لیکن ان کی فریب کاریاں جاری رہیں اور آخرکار انہوں نے مرہٹوں اور نظام کو حیدر علی سے جدا کر کے تنہا لڑنے پر مجبور کر دیا۔ حیدر علی نے ساتھیوں کی بے وفائی سے مجبور ہو کر موقعہ کی نزاکت کا اندازہ کیا اور صلح کی پیش کش کی لیکن انگریز حیدر علی کی تنہائی اور کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

انہوں نے صلح نامنظور کی اور لڑائی جاری رکھی۔ لیکن صاحب عزیمت حیدر علی اس آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ اُس نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر کے انگریزوں پر اس زور سے حملہ کیا کہ انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مدراس پر حیدر علی کا قبضہ ہو گیا۔ اور انگریزوں نے صلح کر کے ۱۷۶۹ء میں عہد نامۂ مدراس کی توثیق کی — اس صلحنامہ کی شرائط میں اہم باتیں یہ قرار پائیں (۱) مفتوحہ علاقہ کی واپسی (۲) جنگی قیدیوں کی رہائی (۳) باہمی امداد و اشتراک

انگریز اس شکست پر سخت برہم تھے اور حیدر علی کی تباہی کے درپے ہو کر اس کو نیچا دکھانے کے نت نئے منصوبے اور سازشیں تیار کرنے لگے۔

اس کے بعد ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے میسور پر حملہ کیا۔ حیدر علی نے معاہدہ مدراس یاد دلا کر انگریزوں سے امداد طلب کی۔ لیکن انگریز ایک سے وعدہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے یہ جال ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ مرہٹوں سے بھی اس قسم

کا وعدہ کئے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے حیدر علی کی مدد سے چشم پوشی اور معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ جو انگریز کی عام روش ہے۔

بعد ازاں جب انگریزوں نے فرانسیسیوں سے ماہی کی بندرگاہ چھین لی تو اس بندرگاہ سے حیدر علی کی رسد بند کر دی۔ اس بات پر حیدر علی نے انگریزوں سے احتجاج کیا۔ انہوں نے کوئی توجہ نہ دی اور آخر حیدر علی کو اعلان جنگ کرنا پڑا۔ اور کرناٹک پر اسی ہزار فوج سے حملہ کر دیا۔ حیدر علی کا بہادر دل سپوت سلطان ٹیپو بھی اس جنگ میں باپ کا دست و بازو بنا ہوا لڑ رہا تھا۔ اس نے انگریزوں کی فوجوں کو منتشر کرنے میں کامیاب کوشش کی۔ اور حیدر علی کی افواج کا پلہ بھاری نظر آنے لگا۔ فرانسیسی حیدر علی کی کمک پر آ گئے اور دوسری طرف انگریزوں نے اپنے ساتھ نظام دکن کو ملا لیا۔ بھاری رن پڑا۔ لیکن انگریزوں کی قسمت نے ساتھ دیا۔ دسمبر ۱۷۸۲ء میں جبکہ انگریز پسپا ہونے کے قریب تھے حیدر علی نے ارکاٹ کے قریب قضا الٰہی سے وفات پائی۔ سلطان ٹیپو نے لڑائی جاری رکھی۔ اور بیدنور و منگلور کے مقام پر ۱۷۸۲ء میں انگریزوں کے دانت کھٹے کر دئے اور شکست فاش دی۔ اور صلح منگلور کے نام سے عہدنامہ پر فریقین نے دستخط کر دئے۔ بعد ازاں انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کو سلطان ٹیپو کے خلاف بھڑکا کر لڑائی شروع کرا دی۔ جو چار سال جاری رہی۔ اس زمانہ میں لارڈ کارنوا لیس ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل تھا۔ اس نے حیدر علی اور ٹیپو دونوں کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کر کے مرہٹوں اور نظام کے ساتھ مل کر ٹیپو سے جنگ شروع کر دی۔

یہ جنگ عرصہ تک جاری رہی ۔ سلطان ٹیپو بڑی جرأت و دلیری سے
اس سہ طاقتی دشمن سے ہر محاذ پر لڑتا رہا ۔ انگریز اپنی طاقت کے علاوہ سازش
اور عیاری کے ہتھیاروں سے بھی مسلح تھے ۔ سلطان نے سرنگا پٹم پر پسپا ہو کر
انگریزوں سے ایک بار صلح کی لیکن ہتھیار نہ ڈالے اور کچھ عرصہ بعد پھر جنگ
کا اعلان کر دیا ۔ اس وقت سلطان نے نپولین بونا پارٹ کو بھی جنگ میں شرکت
کی دعوت دی تھی ۔ لیکن دریائے نیل کے دہانہ پر انگریزوں نے نپولین کے بیڑے
کو تباہ کر دیا ۔ اس وقت لارڈ ولزلی گورنر جنرل تھا ۔ اُس نے جنگ پلاسی کی
مثال اپنے سامنے رکھی اور کلایو بنکر سلطان کی افواج میں سے "میر جعفر" کی
قسم کے غدار تلاش کر لئے ۔ اور اس سازباز کی بدولت سلطان نے جیتا ہوا
میدان ہار کر جام شہادت نوش کیا ۔ انگریزوں نے شیر دل مجاہد اعظم کو
شہید کر کے سرنگا پٹم پر کمپنی کا پرچم لہرا دیا ۔ میسور کی فتحیابی سے انگریزوں
نے گویا کل ہند فتح کر لیا ۔ کیونکہ سلطان ٹیپو کے سامنے انگریز کی عزائم کوئی
حقیقت نہ رکھتے تھے ۔ انکو ہر دم خطرہ تھا کہ سلطان کی شجاعت و عزیمت ایک
دن انگریزوں کو ملک بدر کر کے رہے گی ۔ اب انگریزوں نے اطمینان کا سانس
لیا اور ملک کے چاروں طرف عقابی پنجے پھیلانے میں زیادہ سہولت محسوس کی ۔

مرہٹے اور انگریز

سب سے پہلے انگریزوں نے دہلی کے قلعۂ معلیٰ کی طرف نظریں جمائیں
وہاں مجبور مغلیہ بادشاہ شاہ عالم مرہٹوں کے بس میں تھا ۔ انگریزوں نے

بادشاہ کو مرہٹوں کے چنگل سے رہائی دلانے کی چال چلی اور دہلی کی طرف کوچ کیا۔ اس سے پہلے بادشاہ نے ایک بار ۱۷۸۸ء میں مرہٹوں کے چنگل سے پایۂ تخت کو آزاد کرانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کی مجبوری نے ان کا ساتھ نہ دیا اور آزاد ہونے کے بدلے مرہٹوں نے اپنی گرفت اور مضبوط کر لی تھی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو اپنی پناہ میں اس لئے لینا مناسب سمجھا تھا کہ مسلمان انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان جنگ کے وقت خاموش رہیں۔ انگریزوں کو مغلیہ سلطنت کا بہی خواہ سمجھیں۔ اور ان کے ہوا خواہ رہیں۔

۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک چار ہزار کا لشکر لے کر جمنا کے مشرقی کنارے وسیع میدان میں صف آرا ہوا۔ مرہٹوں نے پندرہ ہزار افواج قاہرہ کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ مرہٹوں کی جمعیت زیادہ تھی۔ لیکن انگریزوں نے اس دلیری، تنظیم، اور جدید آلات حرب کے ساتھ ایسا مقابلہ کیا کہ مرہٹوں کو پسپا ہونا پڑا۔

عروج و زوال

۱۴ ستمبر کو انگریزی فوج قلعہ میں داخل ہوئی۔ مجبور بادشاہ نے جنرل لیک کو اس کی فتح پر مبارکباد دی اور مرہٹوں کے مقابلہ میں اس سے بہتر توقعات وابستہ کر کے لمبے چوڑے خطابات اور خلعت سے سرفراز کیا۔ انگریزی کمپنی نے کرنل اکٹرلونی کو جو پہلے کمپنی کا ڈپٹی ایڈجوٹنٹ تھا دہلی کا رزیڈنٹ مقرر کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس فتح یابی سے بڑا اقتدار حاصل ہوا۔ اور کمپنی کے

گورنر جنرل نے اپنی افواج اور اس کے افسروں کو بڑے بڑے خطابات اور انعامات مرحمت کئے۔ مرہٹوں کی طاقت کچلی گئی۔ دہلی کی شکست کے بعد انہوں نے دوآبہ کا کل علاقہ اور آگرہ انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔

مغلوں کا زوال روز بروز ترقی کرنے لگا۔ اور تیموری جاہ وحشمت، خواب وخیال معلوم ہونے لگا۔ مغلیہ سلطنت محض لال قلعہ کی چار دیواری کے اندر تھی۔ اور وہ بھی برائے نام۔ دراصل مرہٹوں کو مغلیہ تاجدار پر جو فتح پہلے حاصل ہوئی تھی وہ بھی انگریزوں کی شہ تھی۔ اور اس کے بعد انہوں نے مرہٹوں کو کمزور کر کے خود دہلی اور آگرہ کے مضافات پر قبضہ کر لیا۔ یہ منصوبہ برسوں پہلے انگریزوں نے تیار کیا تھا۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں انگریزوں کی قوت اور زیادہ جڑیں پکڑنے لگی تھی۔ اور انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ان کا ستارہ فتح ونصرت کے آسمان پر زیادہ روشن نظر آنے لگا۔ اب انگریز جو تاجروں کی حیثیت سے اس ملک میں آئے تھے کھلم کھلا ملک گیری کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور اپنا حاکمانہ اقتدار بڑھانے میں ہر طرف مصروف ہو گئے۔ انہوں نے قوت کے ساتھ سازشوں، غداریوں کے بھی جگہ جگہ جال بچھائے۔ ملک کی مختلف طاقتوں اور صاحب اقتدار لوگوں اور نوابوں، راجوں کو کمزور بھی کرنے کی کوشش کی اور ان کو اپنے اثر رسوخ اور لالچ کے ذریعے اپنے ساتھ ملاتے اور یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ ان کے ہمدرد ہیں اور وہ ہندوستان پر حکومت کرنا

نہیں چاہتے بلکہ امن و صلح کے ساتھ ملک میں خوشحالی اور بہبودی کے خواہاں ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر حکمران بننے کے منصوبے مضبوط کرتے رہے۔

انگریزی تسلّط اور دیسی افواج

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل سر جارج بارلو تھا۔ یہ بہ ظاہر خلیق اور ملنسار انگریز تھا۔ اس کی پالیسی سپاہیانہ انداز کی سخت گیری کے خلاف تھی لیکن خفیہ طور پر ایسی حکمتِ عملی تیار کر رہا تھا کہ تمام ہندوستانی سپاہیوں کو انگریزی رنگ میں رنگ لے۔ ان کے ظاہرا لباس میں مغربی انداز کو اتنا دخیل کرے کہ وہ ان سے بالکل قریب ہو جائیں۔ اور اپنے ہم قوم ہندوستانیوں کے مقابل صف آرا ہو کر اپنے آپ کو انگریزوں ہی میں شامل سمجھیں۔

اس وقت بنگال۔ بمبئی اور مدراس میں علیحدہ علیحدہ پریذیڈنسی قائم تھی اور ان کی الگ الگ افواج تھیں۔

بارلو کی اس پالیسی کے ماتحت فیصلہ کیا گیا کہ مدراس کی افواج کے ہندوستانی سپاہیوں کی داڑھیوں، مونچھوں کو ترشوا کر انگریزوں کے مشابہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سپاہیوں کی وردی میں جو پگڑی شامل تھی اس میں چمڑے کا ایک فیتہ لگا یا جائے۔ جس سے پگڑی میں بندش زیادہ مضبوط اور انگریزی ٹوپی (ہیٹ) کی طرح معلوم ہونے لگے۔ اس پر ہندو اور مسلمان دونو فرقوں کے سپاہیوں میں ناگواری کا احساس ہوا۔ کیونکہ اس زمانہ کی

معاشرت اور مذہبی روایات کے مطابق یہ باتیں ان کے خلاف تھیں۔ خصوصاً چمڑے کا استعمال براہِ راست مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچانے کا موجب تھا۔ کیونکہ ہندو گائے کو مقدس سمجھ کر اس کے چمڑے کے استعمال سے گریز کرتے تھے اور مسلمان سُور کے چمڑے کو چھونا حرام سمجھتے تھے۔ اور دونوں فرقوں میں یہ گمان تھا کہ انگریز ان کو عیسائی بنانے کے لئے اس طرح ان سے گائے یا سور کے چمڑے کا استعمال کرا رہے ہیں۔ اور ان کے مذاہب خراب کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہندوستانی فوجوں نے ان احکامات کے خلاف ناراضگی ظاہر کی تو انگریز افسر جو اس حقیقت سے واقف نہ تھے حیران ہوئے۔ لیکن کرنل گلسپی جو مدراس کی افواج کا کماندار تھا نہایت عاقل اور مدبّر انگریز تھا۔ بڑی عیاری اور دانائی سے ہندوستانی فوجیوں کی ناراضگی کو دور کرنے میں فوراً کامیاب ہو گیا۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح سے ان کو مطمئن کر کے ان احکام کو عارضی طور پر ملتوی کر دیا۔ اور بعد میں رفتہ رفتہ ان پر عمل درآمد کراتا رہا۔ انگریز افسروں نے ہر ممکن کوشش اس بات کی جاری رکھی کہ ہندوستانی سپاہی جو انگریزی افواج میں شامل ہیں ہر طرح ان کی وفاداری کا دم بھرتے رہیں۔ انگریز ہندوستان پر قبضہ کرنے میں انہیں کی طاقت استعمال کریں۔

پھُوٹ ڈالو اور حکُومت کرو

لیکن اس معاملہ میں مشکل یہ تھی کہ انگریز ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات اور ان کے مزاج کو بخوبی سمجھنے سے قاصر تھے وہ اپنے آپ کو زیادہ مہذّب اور اعلیٰ پایہ سمجھتے تھے اور ہندوستانیوں کو غیر مہذّب اور جاہل تصو

کر کے ان سے زیادہ میل جول نہیں بڑھاتے تھے۔ البتہ اونچے طبقہ کے امیروں اور رئیسوں سے تعلقات بڑھاتے۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور ان کی وضع و معاشرت بھی اختیار کرنے کی کوشش کرتے تاکہ مغرب و مشرق کی تفریق ہندوستانی دماغوں سے دُور ہو جائے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ انگریزوں نے اس ملک میں رہ کر اور امراء سے قربت کے تعلقات قائم کر کے ان کی عادات کا اندازہ کیا۔ نیز یہ دیکھ لیا کہ ان کو خفیہ چالوں کے ذریعہ آپس میں لڑا کر پھوٹ ڈالنا اور الگ الگ فرقوں میں نفرت پیدا کرا کے ان کی قوت کے ٹکڑے کر دینا کمپنی کی حکومت کے قیام میں زیادہ آسان ہے۔ تو انہوں نے دوستی اور ہمدردی کے بدلے سازش اور رعب داب کے طریقے استعمال کرنا شروع کر دئے۔ اور رفتہ رفتہ ہندوستانیوں میں باہمی منافرت اور فتنہ فساد پیدا کرا کے انہیں میں سے ایسے وطن دشمن، غدار بھی اپنے ساتھ شریک کر لئے جو قوم اور ملک کو غیروں کے ہاتھوں سستے داموں بیچنے پر آمادہ ہو گئے۔

اب انگریزوں نے جس بات سے سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی وہ تھی ہندوؤں کی آپس کی فرقہ پرستی، ذات پات کی تمیز۔ ہندو خود آپس میں بٹے ہوئے، چھوت چھات کے جھگڑوں میں مبتلا تھے۔ ایک برہمن کسی دوسرے ہندو کو نیچ سمجھتا تھا۔ سکھ اور ہندو آپس میں متفق نہ تھے۔ ہندو اور مسلمان میں مذہبی اختلافات موجود تھے۔ اس تفریق کو مختلف طریقوں سے انگریزوں کی حکمتِ عملی نے خوب ہوا دی۔ اور ہر فرقہ کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے الگ الگ عہد و پیمان کرتے رہے۔ اور ان کو فوجوں میں شامل کر کے

اپنی وفاداری کا سبق پڑھاتے اور جگہ جگہ بھائیوں کو بھائیوں سے لڑا کر اُن کو آزماتے رہے ۔ تقریباً اٹھارہ سال تک مسلسل یہ عمل اسی طرح جاری رہا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی قوت بڑھانے کے ساتھ اپنے حاکمانہ اقتدار کے پنجے ملک کے اطراف وجوانب پر پھیلاتی رہی ۔ اس عرصہ میں جگہ جگہ انگریزوں نے محاذ بنا کر لڑائیاں لڑیں اور فتح پر فتح حاصل کی ۔ افغانوں سے جنگ کی سکھوں سے جنگ کی ۔ برما میں لڑی ۔ اور ان سب مقامات پر ہندوستانی افواج کے ہاتھوں فتح پائی ۔

ہندوستانی سپاہیوں پر سختی

لیکن ۱۸۲۴ء میں برما اور آسام کے الحاق کے موقعہ پر ۱۸۰۶ء کی فوجی تنظیم کے احکام کی طرح ہندوستانی افواج نے ایک بار پھر احتجاج کا نعرہ بلند کر کے انگریزوں کے احکام کی خلاف ورزی کی ۔

واقعہ یہ تھا کہ جن فوجوں کو برما جانے کا حکم ملا ان میں سے ہندو سپاہیوں نے سمندری سفر سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ ہماری قدیم مذہبی روایات کے خلاف ہے ۔ ہم آسام سے اراکان کے راستے خشکی کا سفر کر کے برما کے علاقہ میں داخل ہونے کو تیار ہیں ۔ فوجی احکام کے مطابق مدراس کے لشکر کو بحری راستہ سے براہ راست رنگون پہنچنا تھا ۔ لیکن بنگال کی فوجوں کو چاٹگام پہنچ کر برما کا سفر کرنا تھا ۔ چنانچہ رجمنٹ نمبر ۴۷ کو جو اس وقت بارک پور کے مقام پر تعینات تھی روانگی کا حکم دیا گیا ۔ لیکن کمپنی ان کے لئے سواری

اور بار بر داری کا کوئی معقول انتظام نہ کر سکی۔ بلکہ فوجوں کو تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنی روانگی کا خود انتظام کریں۔ اور جس طرح بھی ہو سکے جلد محاذ پر پہنچیں۔ یہ کتنی عجیب بات تھی کہ صاحب اقتدار حاکم جو انتظام نہ کر سکے وہ سپاہیوں کے اختیار اور قدرت میں کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس پر فوجوں میں بددلی اور ہراس پیدا ہوا اور اس دوران میں یہ افواہ بھی مشہور ہوئی کہ انگریز افسروں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ تمام فوجوں کو خواہ وہ رضامند ہوں یا نہ ہوں جبراً جہاز پر سوار کرا کے روانہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سارے ہندوستانی لشکر نے چاٹگام جانے سے انکار کر دیا حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ ایک افسر نے چاٹگام سے سواری وغیرہ کا اہتمام کرنے کی پیش کش کی تھی مگر فوجیں اس سے بے خبر تھیں۔ انہوں نے بہر صورت روانگی سے انکار کر دیا۔ انگریز کمانڈر انچیف سر ایڈورڈ پیجیٹ (PAGET) نہایت سخت گیر و شقی القلب افسر تھا۔ وہ اس نافرمانی کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اور اُس نے فوجیوں کے مذہبی عذر کو قطعاً نظر انداز کر کے حکم دیا کہ فوجوں کو بہر صورت روانہ ہونا ہے۔ اگر وہ حکم کی سرتابی کریں گے تو فوجی ضابطہ کے مطابق نافرمانی کے مجرم قرار پائیں گے جس کی سزا بہت سخت ہے اس کے بعد وہ ایک گورا پلٹن کو اپنے ساتھ لے کر سیدھا بارک پور پہنچا۔ تمام ہندوستانی افواج متعینہ بارک پور کو میدان میں صف آرا کر کے اعلان کیا کہ "تم لوگ محاذِ جنگ پر جانے کے لئے بلا عذر آمادہ ہو جاؤ ورنہ اپنے ہتھیار فوراً زمین پر رکھ دو۔ فوجی احکام کی پابندی ہر سپاہی کا فرض ہے۔"

یہ سن کر سپاہیوں نے اپنے سابقہ ارادہ میں کوئی نظر ثانی نہ کی

کیونکہ ان کے نزدیک فوجی احکام کی پابندی سے زیادہ بڑا فرض مذہبی رسوم وقوانین کا تھا جو دیوتاؤں نے ان پر عائد کیا تھا۔ اور ان کے آباؤ اجداد اس کی پابندی کرتے آئے تھے۔

سپاہیوں نے اس موقعہ پر کسی قسم کی مزاحمت بھی نہ کی اور چپ چاپ اپنے ہتھیار رکھدیئے۔ انگریز کمانڈر انچیف غیض وغضب سے بیتاب ہوگیا اس نے بے سوچے سمجھے گورا پلٹن کو نہتے اور مجبور سپاہیوں پر فائر کرنے کا حکم دیا۔ سینکڑوں فوجی گولیوں کا نشانہ بن کر خاک وخون میں تڑپنے لگے اور بقیہ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر اپنے بچاؤ کے لئے بھاگنے لگے۔ انگریز افسر اعلیٰ اس حکم عدولی پر اس قدر برافروختہ تھا کہ اس نے اس پر بس نہیں کی بلکہ بعد میں چُن چُن کر سپاہیوں کے سرغنہ سرداروں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا۔

اس طرز عمل پر ہندوستانی سپاہیوں میں سخت بے چینی اور بددلی پیدا ہوئی۔ عوام کو اس سے بے خبر رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ انگریز فوجی نظم وضبط کے سلسلہ میں اپنے اس ناروا سلوک کو بجائے خود جائز اور مناسب سمجھ رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہبی اور رواجی رسوم وروایات سے ناواقف تھے۔ جو تمام ضوابط وقوانین پر فوقیت رکھتے تھے اور اسی لئے سپاہی اپنے اس طرز عمل کو مذہبی فریضہ سمجھ کر انگریزوں کے سلوک کو بہیمانہ جانتے تھے۔ کیونکہ وہ بے قصور تھے۔

انگریزوں نے اس لڑائی کے لئے دوسرے فرقوں کو طرح طرح کی

ترغیب دے کر آمادہ کر لیا اور اپنی مطلب براری کے بعد فوجوں کی نئی تنظیم شروع کی ۔ لیکن وہ اس ملک کے لوگوں کے مذہبی رسوم اور جذبات سے ناآشنا ہی رہے ۔

انگریزوں نے اپنے قدم جمانے اور حکومت قائم کرنے کی ہر جا و بیجا کوشش کی وہ براہ راست اس طرح کبھی بھی بر سر میدان جنگ آزما نہ ہوئے جس طرح ایک قوم یا ملک دوسرے کے خلاف ملک گیری کے نام پر باضابطہ جنگ کرتا ہے ۔ بلکہ یہی ظاہر کرتے رہے کہ وہ ہندوستانیوں کو زیادہ طاقتور خوشحال اور بافراغت کرنے کے لئے انہیں کے لئے لڑتے ہیں ۔ اور اس فریب کے پردہ میں انگریزوں نے سب سے زیادہ ہندوستانیوں کو یہ لالچ دیا کہ اس ملک میں بدنظمی اور آپس کے تفرقے زیادہ ہیں جس کی وجہ سے قتل وغارت فتنہ وفساد اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے ۔ ہم ملک میں امن وصلح قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ سفر میں ڈاکہ زنی کے خطرات ہیں ۔ ٹھگوں کے گروہ جگہ جگہ مسافروں پر چھاپے مارتے ہیں ۔ ان سب تکالیف کا معقول انتظام کر کے عام پریشانی کو دور کرنا ۔ رعایا کو آرام ، چین سے زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں ۔ غرض ان ملک گیر سازشوں کی بدولت تاجر انگریز مالکوں کو غلام بنانے میں ہر سعی وجہد کرتے رہے ۔ اور رفتہ رفتہ دہلی ۔ بنگال ۔ دکن پر مسلط ہو کر افغانوں کے بعد روہیلوں کی طرف متوجہ ہوئے ۔

ہندوستان میں مسلمان

پنجاب میں سکھوں نے سر اٹھایا اور حکمران بن کر مسلمانوں کو

طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ اس عرصہ میں مسلمانوں کی حالت سارے ملک میں زیادہ کمزور ہوتی گئی۔ انہوں نے تقریباً ہندوستان پر ایک ہزار سال سلطنت کی۔ لیکن اب وہ چاروں طرف سے نرغے میں تھے۔ یہ حال دیکھ کر اکابرین اسلام خصوصاً علماء و صوفیاءِ کرام نے مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم کا بیڑا اٹھایا۔ حضرت شاہ سید احمد شہیدؒ نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام دشمنی کے فتنہ کو فرو کرنے اور مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی حفاظت کی تدابیر کے لئے عملی قدم اٹھایا۔

حضرت شاہ صاحب کی قیادت میں جس باکار و باوقار تحریک کا آغاز ہوا وہ "تحریک مجاہدین" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل تھے وہ حضرت شاہ صاحب اور ان کے رفقائے کار خصوصاً حضرت شاہ اسماعیلؒ کے زیر ہدایت غیر مسلم و غیر دینی فتنہ و شر کو دور کر کے مسلمانوں کے تحفظ کی خاطر علمی و عملی مساعی میں مصروف ہوئے۔ اس فلسفۂ انقلاب کی روح روہیل کھنڈ سے لے کر پنجاب اور صوبۂ سرحد تک دوڑ گئی۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے سرفروش مجاہدین کے ساتھ علم ہی کی نہیں عمل کی تلوار بھی اٹھائی۔ سب سے پہلے پنجاب میں سکھوں کے شر و فساد کو دبانے کے لئے سرمیدان صف آرا ہوئے۔

رنجیت سنگھ نے مجاہدین کے جوش و عزیمت کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ اور صلح کر لی۔ لیکن سازشوں اور غداریوں نے مدِ مقابل دشمنوں سے بڑھ کر کام کیا۔ ملت فروش وطن دشمن، پشت پر خنجر زنی کر کے مجاہدین کی

شکست کا سبب بنے ۔ آخر بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ حیرت انگیز عزیمت و جرأت سے جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔ تحریک جہاد دب گئی ۔ مگر ختم نہ ہوئی ۔ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جاسکا

چونکہ یہ کوئی وقتی جوش یا ہنگامی ولولہ کا عارضی اثر نہ تھا۔ بلکہ ایمان و صداقت کی روشنی میں منظم فلسفۂ انقلاب کی دعوت تھی ۔جس کی تہ میں ملی سیاست کی حقیقی روح کارفرما تھی ۔

بقولِ شاعر ؎

نے پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے

ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

یہ تحریک ابتدا میں ظاہرا طور پر سکھوں کے فتنہ سے اسلام کو نجات دلانے کی غرض سے شروع ہوئی تھی لیکن دراصل غیر ملکی اقتدار سے ملک کو آزاد کرانا اس کی غایت تھی ــــ تحریکِ جہاد کے دوسرے رہنما حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ۔ مولانا عبدالحیؒ اور ان کے رفقاء اس تحریکِ آزادی کو جاری رکھنے میں سرگرم کار رہے ۔ اور جگہ جگہ ان کے معتقدین اور رضاکاروں نے انقلابی سرگرمیوں کو خفیہ طور پر جاری رکھا ۔ اور مسلمان جوق در جوق اس جماعت میں شریک ہوتے رہے ۔

اودھ کے اکثر اضلاع اور روہیل کھنڈ میں اور دلی میں اس انقلابی

تحریک کی چنگاریاں موجود تھیں - اس جماعت کے بے شمار پیرو درپردہ علمی و سیاسی تعلیم کے ساتھ شمشیر و تفنگ کی تربیت میں مصروف تھے۔

تاجدار مغلیہ ابوظفر بہادر شاہ

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کی وفات پر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے - اس وقت ان کی عمر ---- سال کی تھی۔ لیکن اپنے پیشرو سلاطین کی طرح ان کی حیثیت بھی لال قلعہ کی چار دیواری میں بند انگریزوں کے وظیفہ خوار کی تھی۔ جو اختیارات سے محروم محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ لیکن تیموری سطوت کے نام لیوا اقتدار سے محروم ہو کر بھی مغلیہ عظمت و شان کا مظاہرہ کرتے - حالات کچھ ہی ہوں لیکن مزاج و کردار شاہانہ تھا۔ بے سروسامانی اور بے لبسی میں بھی کروفر عالمگیری تھا۔ اور طبع فیاض، تیموری شجاعت و ہمت کے مالک تھے۔ لیکن حالات اتنے ناسازگار ہو چکے تھے کہ سلطنت کی بحالی اور حکومت مغلیہ کے ازسر نو قیام کے لئے کوئی قدم اٹھانا دشوار تھا۔ انگریزوں نے پہلے ملک کو ٹکڑوں میں تقسیم کرایا۔ تمام طاقتیں منتشر ہو گئیں مغلیہ سلطنت کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد کمپنی نے رفتہ رفتہ سارے ملک پر قبضہ جمانے کی تدبیریں کیں -

بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے - انگریز دربار شاہی کے ادب آداب کا ابھی تک پورا لحاظ رکھتے تھے - نذریں گزارتے۔ بادشاہ اعلیٰ حکام انگریزی کو خطابات اور خلعت عنایت کرتے۔ مگر حکومت کمپنی کی تھی۔ خزانوں اور دفترو

پر اس کا قبضہ تھا۔ اور ملک میں اسی کا حکم چلتا۔

اب وہ زمانہ آچکا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک میں ہر طرف اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔ اور شاہی اقتدار کو بھی محصور کر رکھا تھا۔ اور یہ جو کچھ ہوا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں کے بل بوتے پر۔ انہیں نے اپنا خون پانی کی طرح بہا کر ہر جگہ انگریزوں کا بول بالا کیا اور ملک وقوم کو غلامی کے غار سے قریب لانے میں غیر ملکی آقاؤں کا ساتھ دیا۔

اب انگریز کمپنی کی حکومت قائم کر چکے تھے گو انہوں نے اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا تھا۔ سکہ برائے نام مغلیہ تاجدار کے نام کا جاری تھا۔ لیکن کمپنی کاروبار میں اپنا سکہ بھی چلا رہی تھی۔ اور نظامِ حکومت میں پوری طرح دخیل تھی۔ عدالتیں۔ محصولات سب کمپنی کے نام پر تھے۔ تمام اضلاع میں انگریز حاکم مقرر تھے۔ فوجوں کی کمان انگریز افسروں کے ہاتھ میں تھی۔

بہادر شاہ بادشاہ لال قلعہ کی چار دیواری میں بے قابو اور بے اختیار بیٹھے حالات کا اندازہ کر رہے تھے۔ وہ بہت کچھ سوچتے۔ مگر صورتِ حال سے مجبور ہو کر کچھ بھی نہ کر سکتے۔ ملک میں بعض مسلم رہنما اور بہادر سردار اپنی اپنی جگہ تدبیریں سوچتے اور اپنی محدود قوتیں مجتمع کرنے کی کوشش کر کے سلطنتِ مغلیہ کی بحالی کے مشورے کرتے اور غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں بے چین تھے۔ بادشاہ کے لئے ان کی عمر سب سے بڑی دشواری تھی۔ کبر سنی میں بے زر، بے بس ہو کر اگر وہ تیموری شجاعت کے سہارے عملی میدان میں قدم اٹھانے کا ارادہ بھی کرتے تو گرد و پیش کے ناسازگار حالات آڑے آتے۔ انگریزوں

نے ایک ایک کر کے ملک کے تمام علاقوں میں جہاں جہاں قبضہ کیا تھا ان کے والیوں کو ختم کرنے کے بعد ان کے جانشینوں کو بھی نظر بند اور بے بس کر رکھا تھا۔

پیشوا خاندان جس کی قیادت میں مرہٹوں کی عظیم سلطنت اور قوت تھی بے دست و پا کئے جا چکے تھے۔ سلطان شہید ٹیپو کے صاحبزادگان کو ویلور سے کلکتہ لے جا کر نظر بند کر دیا۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے کو ملک بدر کر کے برطانیہ کے جزائر کے دور و دراز مقام پر لے جا رکھا۔ اس طرح ہر ممکن خطرہ کو محصور و مقید کر کے کمپنی کی حکومت کو مضبوط اور محفوظ کیا جا رہا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے بھی کیا گیا کہ انگریزوں کو اندیشہ تھا کہ یہ کمزور قوتیں ایک دن منظم و متفق ہو کر کہیں ایک دن مغلیہ تاجدار کو شہنشاہ بنانے اور دہلی کو مرکز قائم کر کے قومی حکومت کا اہتمام نہ کر لیں اور انگریزوں کو بے نیل و مرام وطن جانا پڑے۔

انگریز حکام اعلیٰ کئی بار بہادر شاہ کی برائے نام بادشاہت ختم کرنے کے بھی منصوبے سوچ چکے تھے مگر وہ خائف تھے کہ کہیں عوام میں بادشاہت کے نام پر بغاوت نہ ہو جائے۔ اس لئے رفتہ رفتہ بادشاہ کے اختیارات کو ختم کر کے مرکزیت کی شکست کا ارادہ کر رہے تھے۔ اور اس طرح موقعہ کے منتظر تھے کہ رہی سہی ظاہر داری کو بھی ختم کر دیں۔ مغلیہ تاجدار کی برائے نام بادشاہت کا خاتمہ کریں اور اودھ و دیگر ریاستوں میں ان کے والیوں کو زیر حکومت برطانیہ لا کر کل ہند پر اپنی بادشاہت کا سکہ چلائیں۔ اس کے لئے انہوں نے

بہت سی تدابیر اور درپردہ حکمت عملی کی چالیں روا رکھیں۔ ساتھ ہی مغربی تہذیب و معاشرت کو ملک میں خفیہ طور پر پھیلانے اور عیسائیت کی تبلیغ کی بھی کوشش کی۔ ان اغراض کے لئے انہوں نے جو عمل کئے ان کا نام "اصطلاحات" رکھا۔ ان جدید اصطلاحات کی زد میں سب سے پہلے ہندو مذہب اور فرقے آئے۔

ستی کی بندش

کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ کے حکم سے ۱۸۳۰ء کے لگ بھگ ایک قانونی ضابطہ کے تحت "ستی کی رسم" بند کرائی گئی۔ ہندو عورت جس کا خاوند وفات پا جائے خود کو زندگی سے بیزار سمجھتی اور قدیم روایات و رسوم کے مطابق اس کی چتا (نعش) کے ساتھ آگ میں جل کر "ستی" ہو جاتی۔ انگریزی تہذیب کے قانون نے اس رسم کو خلافِ انسانیت قرار دیکر بند کرانے کی ٹھانی۔ ہندو اس کو براہ راست اپنے مذہب میں مداخلت سمجھتے تھے اس لئے ہر طرف اس کی مخالفت ہوئی۔ اور ایمہرسٹ نے اپنی اس بے وقت راگنی کو بند کر کے قانونی تجویز واپس لے لی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کے جانشین لارڈ ولیم بنٹنگ نے جرائت مندانہ اقدام کر کے اس تجویز کو باقاعدہ قانونی شکل دیدی۔ اور اس کے خلاف ورزی کو سنگین جرم قرار دیا۔

بنگال کے چند روشن خیال ہندو لیڈروں نے بھی "ستی" کی رسم کو خلافِ انسانیت فعل کہہ کر اس کی مخالفت کے لئے آواز بلند کی تھی جن میں راجہ رام موہن رائے اور دوارکا ناتھ ٹگور کے نام خاص تھے۔ ولیم بنٹنگ

نے ان لوگوں کی آواز کا سہارا لے کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا۔ لیکن ہندو عوام میں اس سے سخت بے چینی اور اضطراب پھیلا ---- مجبور ہو کر چپ ہو رہے لیکن مخالفانہ جذبات دلوں میں اندر ہی اندر سلگتے رہے۔ مسلمان حکمرانوں نے بھی اپنی ہندو رعایا کی اس رسم کو کبھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا مگر وہ جانتے تھے یہ معاملہ ایک فرقہ کے روایتی آئین و رسوم کا ہے جس نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے اس کو جبریہ بند کرا کے ان کے دلی جذبات کو ٹھیس پہنچانا گوارا نہ کرتے تھے، ستی کی رسم بند ہونا بظاہر ہندوؤں کے لئے تکلیف دہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے بھی اس کو اچھی نظر سے نہ دیکھا کیونکہ انہیں خیال ہوا کہ انگریزوں نے جس طرح اس ملک کے ایک فرقہ کے قدیم رسوم میں مداخلت کی ہے آئندہ وہ ہمارے مذہب یا رسوم میں بھی رخنہ اندازی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دونوں فرقے اس اقدام کو عیسائی حکومت کا ناروا فعل تصور کر کے دینی مداخلت سے تعبیر کرتے تھے۔

ہندو مسلم اوقاف میں مداخلت

۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے ہندو مذہب میں مداخلت کے لئے ایک اور ناروا اقدام اٹھایا۔

برصغیر پاک و ہند ابتداء سے مقدس و متبرک مقامات اور عبادت گاہوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ہر عہد میں حکومت مختلف فرقوں کے عقائد و مذاہب کی مقدس عبادت گاہوں، مندروں، مسجدوں، گوردواروں، مزارات اور

تیرتھ گاہوں وغیرہ کے تحفظ کی امین ہوتی تھی۔ لیکن ان سب کے انتظامات اور دیکھ بھال کی پوری نگرانی آزادانہ طور پر اپنے اپنے مذاہب کے لوگوں ہی کے سپرد ہوتی۔ اور یہ تمام مقامات اوقاف کی صورت میں خود مختار مذہبی کمیٹی کے سپرد تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مسلم بادشاہ نے مندر یا تیرتھ کے انتظام میں دخل دیا ہو یا ہندو راجہ نے مسلمانوں کے مزارات اور مساجد کے نظام میں اپنے حاکمانہ اختیار سے کام لیا ہو۔ لیکن ان روایات کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوؤں کے تمام مندروں کے انتظامات اپنی نگرانی میں لے لئے۔ حتیٰ کہ جگناتھ پوری کے مشہور مندر پر انگریزی حکومت کا قبضہ ہو گیا۔ ہندوؤں نے جائز طور پر اس کے خلاف احتجاج کیا۔ کیونکہ ان کو گمان تھا کہ عیسائی حکومت رفتہ رفتہ ان کے مذہبی معاملات میں دخیل ہو کر عیسائیت کو عام کرنے کے درپے ہے۔ مسلمانوں نے بھی اس احتجاج میں اپنے ہم وطن ہندو بھائیوں کا ساتھ دیا۔ اور مذہبی رواداری کا مطالبہ کیا۔ آخر کمپنی کو ہندوستانی عوام کی رائے کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور قدیم انتظامات بحال کر دئے گئے۔

عیسائیت کی تبلیغ

لیکن عیسائی پادریوں نے اپنی تبلیغ کا کام زور شور سے جاری رکھا اور اسکولوں۔ ہسپتالوں اور محتاج خانوں وغیرہ میں کم استطاعت لوگوں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش ہوتی رہی۔ اور یہ پادری حکومتِ انگریزی کے ملازم ہوتے جو سرکاری طور پر لوگوں کے دین و مذہب کو تبدیل کرانے کا

فریضہ انجام دیتے۔ اسکولوں میں انگریزی تعلیم کے آغاز کے ساتھ اس بات پر خاص توجہ کی گئی کہ استاد جو زیادہ تر انگریز تھے، عیسائی مشنری ہوتے اور ان کا کام انگریزی سکھانے کے ساتھ خاص طور پر عیسائیت کی تعلیم دینے کا ہوتا۔ اس منظم کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب طبقوں میں عیسائیت کی تعلیم عام ہو کر ہندوستانیوں کے مذاہب تبدیل کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ بعض تعلیم یافتہ ہندو خصوصاً بنگالی بڑی بڑی تنخواہوں پر عیسائی مشنری کے طور پر کام کرنے لگے۔ اسکولوں میں انجیلِ مقدس کی تعلیم اور اس کے اصولوں کی پیروی پر بھی خوب زور دیا جانے لگا۔ ساتھ ہی انگریزی حکام بھی اپنے اپنے اضلاع میں عیسائی مشنریوں کا کام انجام دینے لگے۔ عیسائی پادریوں کے علاوہ ضلع کے حاکم انگریز دیہات میں اپنے مذہب کی تبلیغ میں سرگرم نظر آتے جیل خانوں میں قیدیوں کو انجیل سنائی جاتی اور ان کے اپنے دینی اصولوں کی جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو عیسائیت کے اصولوں کی پیروی کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ جو لوگ تبدیل مذہب کرے ان کو خاص مراعات دی جاتیں۔

رفتہ رفتہ یہ باتیں مختلف علاقوں اور مختلف معاملات میں ایسی بڑھتی گئیں کہ عوام کو اپنے اپنے مذاہب کی طرف سے پورے طور پر خطرات لاحق ہو گئے اور وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ انگریزوں کی حکومت ان کے ملک میں عیسائی راج قائم کر کے کل ہند کو اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہتی ہے۔

جیل خانوں کے کھانے پر پابندی

ان امور اور خطرات کو ۱۸۴۵ء میں اور بھی تقویت ملی جبکہ جیل خانوں

اور ہندوستانی فوجوں کے کھانے اور قدیم مروجہ طریقوں میں تبدیلی کر کے نئے طریقے رائج کئے گئے۔ کہ ہندو قیدیوں کے لئے جو پہلے اپنے اپنے لئے خود کھانا تیار کرتے تھے۔ اب ہر جیل خانہ میں ایک ایک برہمن باورچی مقرر کر دیا گیا جو بلا امتیاز ذات تمام ہندوؤں کا کھانا ایک جگہ پکاتا ان سب قیدیوں کو اکٹھے کھانا پڑتا۔

اس بات سے اعلیٰ ذات کے ہندو قیدیوں میں سخت بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ برہمنوں میں بھی کئی فرقے ہیں۔ اور اعلیٰ ذات برہمن کسی ادنیٰ برہمن کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے۔ چنانچہ اس نئے دستور کیوجہ سے تمام ہندو قیدیوں میں اپنی ذات اور مذہب میں مداخلت کے سبب ناراضی پیدا ہونے لگی۔ اور رفتہ رفتہ عام شہریوں میں بھی اس بات کے پھیل جانے سے اضطراب پیدا ہوا۔ پھر یہ بات بھی مشہور ہونے لگی کہ جیل خانوں کے علاوہ فوجی چھاونیوں میں بھی ہندو سپاہیوں کو اس طرح اکٹھے کھانا ملتا ہے۔ اور اس طرح مذہبی مداخلت کے خلاف انگریزی حکومت کے اقدامات غصہ اور نفرت سے دیکھے جانے لگے۔ اور آخر بڑھتے بڑھتے ۱۸۴۵-۴۶ء میں ان تبدیلیوں کے خلاف پٹنہ میں بغاوت بھی ہوئی۔ چنانچہ بعد میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران انگریز کمپنی کے حکام کی بداعمالیوں کا ذکر کرتے ہوئے۔ اس بدسلوکی کا حوالہ دیا اور بیان کیا کہ "انگریزوں نے عرصہ دراز سے قیدیوں کے مذہبی جذبات اور ذات پات سے لاپرواہی برت کر ان پر ناروا جبر و سختی اختیار کی۔

مذہبی و معاشرتی مداخلت

ہندوستانی عوام انگریزوں کے مخالفانہ تشدد اور مخالفانہ برتاؤ کو بیچینی سے دیکھتے رہے۔ اور انگریزوں کے طور طریق ان کی معاشرت، تمدن اور رسم میں دخل انداز ہوتے رہے۔ ہندو مسلمان سب ہی کو یہ باتیں ناگوار تھیں مگر انہوں نے مجبوراً گوارا کیں۔ لیکن مذہب کی مخالفت کسی کے لئے برداشت کے قابل نہ تھی۔ اور انگریز حکام نے خفیہ سازش سے چند زرخرید ہندوستانیوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے یہ عمل منظم طور پر جاری رکھا۔ پادری گوپی ناتھ نندی نے اس سلسلہ میں انگریزوں کی خیرخواہی میں بے شمار ہندوستانیوں کو عیسائی بنا ڈالا۔

نیا بندوبست اور نئی تعلیم

اسی عرصہ میں گاؤں کے پٹواریوں اور محاسبوں کے لئے نئے بندوبست کے ماتحت دستور بنایا گیا کہ وہ دیو ناگری رسم الخط میں ہندی سیکھیں اس کے لئے انہیں مشنری اسکولوں میں داخلہ لینا ضروری قرار دیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک قوم پرست مسلمان ڈپٹی کلکٹر حکمت اللہ خان نے بڑی مخالفت کی اور مشنری اسکولوں کی تعلیم کے طریقوں کو ہندوستانیوں کے حق میں نامناسب قرار دیا۔ لیکن انگریز حکام نے ان کے احتجاج کی پرواہ کئے بغیر اپنے حکم کو نافذ کر دیا۔ گوپی ناتھ نندی نے اس موقعہ پر انگریزوں کی

خوشنودی کے لئے اطمینان و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "تین سو سے زیادہ جوانوں کو نہ صرف انجیل کی تعلیم دی گئی بلکہ ان کو باقاعدہ دعاؤں میں شامل کر کے عیسائیت کے اصول سکھائے گئے اور انجیل مقدس کے نسخے انہیں گھر لے جانے کو دیے گئے تاکہ وہ اپنے گھروں میں بھی ہماری تعلیم پھیلا سکیں۔"

اس طرح مدارس میں مختلف طریقوں سے عیسائیت پھیلانے کی کوشش جاری رہیں۔ اس کے علاوہ فوجوں میں جہاں عام طور پر مذہبی جذبات کا زیادہ دخل نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور فوجی افسر اس قسم کی فرقہ وارانہ تفریق سے آزاد اور بے لاگ ہوتے وہاں بھی انگریز افسروں نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی جس میں ترغیب و جبر ہر ممکن طریقہ کو استعمال کیا گیا۔ اور ہندوستانی سپاہیوں کو تبدیلِ مذہب پر آمادہ کرنے کے لئے مشنری افسروں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ادھر مجسٹریٹوں، ججوں اور ضلع کے تمام انگریز حکام نے پادریوں کو عام اجازت دی کہ وہ جیل خانوں میں جائیں اور قیدیوں کو مسیحی دین پر لانے کے لئے وعظ سنایا کریں۔

غرضیکہ مدارس، جیل خانے اور فوجی چھاؤنیاں تمام مقامات حکومت کی طرف سے باقاعدہ تبلیغی مرکز بن گئے۔ اور ہر جگہ عیسائیت کی تبلیغ عام ہو گئی۔ سر سید احمد خان نے بعد میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ عام طور پر اسکولوں کے ڈپٹی انسپکٹران دیسی پادری ہوا کرتے تھے۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز اور دیسی افسروں میں سب ہی عیسائیت

کی تبلیغ میں پیش پیش تھے اور کمپنی نے تہیہ کر لیا تھا کہ جس طرح ہو سکے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو عیسائی بنا کر عیسائی حکومت کے قدم مضبوط کرنے میں آسانیاں پیدا کی جائیں۔ لیکن ہندوستانی عوام اپنے دین و مذہب میں نہایت پختہ عقیدہ رکھتے آئے ہیں۔

سرسید احمد فرماتے ہیں کہ " اس زمانہ میں حکومت کا عام دستور ہو گیا تھا کہ تنخواہ دار مشنری جگہ جگہ مقرر تھے جو ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا کام انجام دیا کرتے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دینی تبلیغ کے سلسلہ میں تو کسی کو اجازت نہ تھی کہ کھلم کھلا اپنے مذہب کی اشاعت اور پرچار کریں۔ مولوی اور پنڈت اس قسم کی دین دھرم کی باتیں مسجدوں، مندروں اور نجی بیٹھکوں میں چھپ کر کیا کرتے لیکن اس کے خلاف عیسائی مشنریوں کو اجازت تھی کہ وہ بازاروں اور پبلک مقامات پر برسرِ عام عیسائیت کی تبلیغ کے لئے لکچر دیا کرتے۔ اور فوجوں، اسکولوں اور جیل خانوں میں سرکاری مشنری باقاعدہ اس کام کے لئے مقرر تھے۔"

اودھ کی تنظیم اور جبریہ تخریب

مذہبی مداخلت اور تبدیلئ مذاہب کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغلیہ تاجدار کے اختیارات سلب کرنے کی کوشش بھی جاری رکھی اس کے ساتھ ہی اودھ اور دوسری ریاستوں میں نوابوں اور راجوں کے اختیارات ختم کر کے اس بات کی کوشش کی کہ رفتہ رفتہ تمام ریاستوں کو

انگریزی عملداری میں شامل کر لیا جائے۔

۱۸۴۷ء میں اودھ کے تخت پر سلطان واجد علی شاہ اپنے والد نواب امجد علی شاہ کی وفات پر رونق افروز ہوئے۔ واجد علی شاہ اپنی ولیعہدی کے زمانہ سے ہی اپنے بزرگوں کی حالت، اور عیش و آرام کے اشغال دیکھ کر کڑھتے آئے تھے اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا اندازہ کر کے ان کا دل بے چین تھا کہ کسی طرح ملک کی تنظیم ہو۔ اور اس غیر ملکی تسلط کا خاتمہ کرنے کی ہم میں طاقت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا انھوں نے تخت نشین ہو کر سب سے پہلے اپنے علاقہ کی فوجوں کو منظم و مرتب کرنے کی طرف توجہ کی، سوار اور پیدل پلٹنوں کی عام بھرتی کر کے روزانہ پریڈ شروع کی۔ اور انہیں اپنی نگرانی میں فوجی قاعدے سکھانے لگے۔ رسالے اور پلٹنوں کے خاص خاص نام رکھے جن میں حیدری رسالہ، ترچھا رسالہ۔ نادری پلٹن۔ بانکی پلٹن اور اختری پلٹن وغیرہ خاص تھے۔ سلطان خود نیزہ بازی، تیر اندازی اور شمشیر زنی کی تربیت میں حصہ لیتے۔ فوجوں میں مقابلے کراتے۔ انعامات تقسیم کرتے۔ اور جو سپاہی سستی برتتے ان کو سخت سزائیں اور جرمانے کئے جاتے۔ یہاں تک کہ اگر سلطان خود کسی دن پریڈ پر تاخیر سے پہنچتے یا غیر حاضر ہو جاتے تو فی یوم اپنے اوپر دو ہزار روپیہ جرمانہ کر کے فوج کو تقسیم کر دیتے۔

آخر رزیڈنٹ انگریزی کو سلطان کی ان سرگرمیوں کی خبر ہوئی۔ اور اُس نے انگریزی حکومت کے مفاد کے لئے انہیں خطرناک سمجھ کر سلطان کو ہدایت کی کہ وہ فوجی تنظیم میں دلچسپی نہ لیں۔ کیونکہ ان کو فوج کی کوئی ضرورت

نہیں اگر کبھی ضرورت بھی ہو تو انگریزی فوجیں ان کی مدد کے لئے کافی ہیں چنانچہ تمام فوجوں کو برطرف کر دیا گیا۔ اور بھرتی بند ہو گئی۔ سلطان اس سے بیحد مغموم اور دل برداشتہ ہوئے۔ اب انہوں نے فنونِ لطیفہ کی ترقی میں پوری انہماک سے دلچسپی لینا شروع کی۔ یہ انگریزی حکومت کے عین مطابق تھا۔ لہذا انگریزوں نے پوری توجہ سے اپنے خفیہ مخبر تعینات کر کے سلطان کو عیش و عشرت اور گانے بجانے میں مشغول کر دیا۔ اسطرح اودھ کے تمام علاقوں میں نوابوں اور راجوں میں تفریح و تفنن۔ اور عیش و فراغت کی دلچسپیاں بڑھتی گئی۔ اور انگریز حکام نے ان سے دوستی کے پردے میں اپنے اغراض وابستہ کر کے ان کی سرگرمیوں کو خوب ہوا دی۔ مقصد یہ تھا۔ کہ وہ قومی و ملکی معاملات سے بیخبر اور لاپرواہ رہ کر انگریزی حکومت کے سایہ میں آرام سے رہنا گوارا کریں۔

عیسائیت کی آغوش میں

بعد ازاں کئی ضابطے ایسے نافذ کئے گئے جن کا مقصد ہندوستانیوں کو عیسائیت کی ترغیب دینا تھا۔ ان میں خصوصیت سے ۱۸۵۰ء کا ایک ضابطہ نمبر ۲۱ مشہور ہے جس کی رو سے جو ہندوستانی تبدیل مذہب کر لے وہ اپنے اجداد کی جائداد کا وارث ہو سکتا ہے۔ ہندو، مسلمان دونوں فرقوں نے اس ضابطہ کو اپنے مذاہب کے خلاف عیسائیت کا معاون سمجھا۔ اس ضابطہ سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ کیونکہ اسلام کے قوانین وضوابط کے لحاظ سے کوئی شخص جو غیر مذہب ترک کر کے مسلمان ہو جائے اس کو اپنے موروثی

ترکہ کا حقدار ہونا جائز نہیں - اور ہندو دھرم کا رواج ہے کہ وہ کسی غیر مذہب کے شخص کو اپنے مذہب میں داخل نہیں کرتے - اس طرح ہندؤں اور مسلمانوں دونوں ہی نے سمجھ لیا کہ یہ ضابطہ براہ راست عیسائیت کی تبلیغ کو فروغ دینے کے لئے ہے - اور اس سے کسی اور مذہب کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا - کیونکہ ہندو اور نو مسلم لوگوں کا اس ضابطہ کے مطابق حق وراثت پانا ممکن نہیں - بلکہ مسلمانوں سے زیادہ ہندؤوں کے حق میں یہ ضابطہ زیادہ نقصان دہ اور خطرناک تھا - کیونکہ وہ ایک طرف تو نو عیسائی ہونے والے عزیز سے جدا ہوتے تھے اور دوسرے موروثی جائداد میں سے بھی ایک حصہ سے ہاتھ دھونا پڑتا - اور مسلمان جو اس سے پہلے عیسائیت کی طرف راغب نہ تھے اس ضابطہ کو انحرافِ دین کا محرک سمجھنے لگے - چنانچہ پادری گوپی ناتھ نے اس ضابطہ کے بعد ۲۴ آدمیوں کو عیسائی بنایا جن میں سے دس مسلمان تھے - اس طرح ہندوستان کے تمام فرقوں کے لئے عیسائیت کا فتنہ خطرناک صورت اختیار کرنے لگا - اور رفتہ رفتہ علماء اور پنڈتوں نے اپنے اپنے حلقوں میں اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا شروع کیا - اب انہوں نے جیل خانوں - مدرسوں اور کالجوں وغیرہ کی تبلیغ کا بغور اندازہ کرنا شروع کیا - اسی عرصہ میں اسکولوں اور کالجوں میں جہاں اب سے پہلے عربی - فارسی - سنسکرت اور مختلف قومی مذاہب کی دینی تعلیم کی کتابیں رائج تھیں - حکومت کے ضوابط کے تحت ایک ایک کرکے کم ہوتی نظر آئیں - کالجوں میں فقہ - حدیث اور ہندو شاستروں کی کتابوں کی جگہ انجیل کے مختلف حصے شامل ہونے لگے - قومی زبانوں اور علوم شرقیہ کو جو

درجہ حاصل تھا ان کی جگہ انگریزی علوم اور زبان نے لے لی۔ انگریزی زبان اور علوم ہر طرح قابلِ ترجیح قرار پائے۔ ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے صرف انگریزی داں لوگوں کو ملنے لگے۔ اور ان سب باتوں کے ساتھ مسیحی دین اختیار کرنے والے طالب علموں کو خاص انعامات و مراعات دی جانے لگیں۔ مذہبی فتنہ سب سے پیش پیش تھا۔

رفاہِ عامہ کے کاموں میں بھی ہندوستانیوں کے مذہبی اور معاشرتی امور سے غفلت برتی جانے لگی۔ چنانچہ محکمہ امور عامہ نے اپنے قدیمی طریقوں کو نظر انداز کر کے مندروں، مسجدوں کی مرمت اور تعمیری کاموں کی طرف سے قطعاً لاپرواہی اختیار کی۔ اس کی جگہ سڑکوں کی تعمیر اور گرجا گھروں کی دیکھ بھال کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ہسپتالوں میں عام مریضوں سے لاپرواہی برتی جانے لگی۔

اس سلسلہ میں ڈپٹی ہدایت علی کی رپورٹ کے مطابق ہسپتالوں سے مستورات کے پردہ کی رسم اڑادی گئی، جو سخت دل آزاری کا باعث تھی۔ ۱۸۴۹ء-۵۰ء کے دوران مختلف اضلاع خصوصاً شاہ جہاں پور میں حکام ضلع اور حکّام صحت نے باضابطہ اعلان کر دیا کہ وہاں کے ہسپتالوں میں پردہ نشین اور کم استطاعت کے لوگوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا۔ اور صرف اعلیٰ طبقہ کے عورتوں مردوں کو زیر علاج رکھا جائے گا۔

دیسی فوجوں میں مزید بے چینی

ہندوستانی عوام اور سپاہیوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات

برانگیختہ ہونا شروع ہو گئے تھے۔

چنانچہ ۱۸۵۲ء میں برما کی دوسری لڑائی چھڑی - اس کے لئے ہندوستانی سپاہیوں کی خدمات کی ضرورت لاحق ہوئی - اور فوجوں کو سمندر پار بھیجنے کی تجویز زیر غور ہوئی - لارڈ ڈلہوزی جو ان دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل تھا - نہایت مدبر انگریز تھا - اس نے بنگال کے سپاہیوں کو ان کی مرضی کے خلاف بالجبر سمندر پار سفر کرنے کی تجویز مسترد کر کے تمام سپاہیوں سے ان کی مرضی دریافت کر لینے کا حکم دیا - باوجودیکہ کرنل بچٹ کے مظالم کی یاد ان تمام سپاہیوں کے دلوں میں موجود تھی - جو پہلی جنگِ برما کے موقعہ پر بنگالی سپاہیوں پر روا رکھے گئے تھے - لیکن ۳۸ ویں دیسی انفنٹری نے بلا خوف وہراس جنگی محاذ پر جانے سے انکار کر دیا - لارڈ ڈلہوزی نے اس موقعہ پر دانستہ ان کی اس کوتاہی پر چشم پوشی کی اور ہندوستانی سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض تبدیل مذہب کی تحریک اور عمل ہی ایک ایسا فتنہ تھا جو انگریزی حکومت نے اس برِ صغیر پر نازل کر کے ہندوستانیوں کے لئے ہر طرح کے مصائب کھڑے کر دیئے تھے۔ اور اہل ہند اس غیر ملکی حکومت کے ہر طرزِ عمل کو شک کی نظر سے دیکھنے میں حق بجانب تھے۔

بدنظمی میں اضافہ

عدالتوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کے دروازے بند ہو چکے

تھے۔ انگریز جو اپنے انصاف اور قانونی تدبّر کے لیے دنیا میں مشہور رہیں۔ انہوں نے اپنی بدعہدی، لاقانونیت اور جبر و تشدّد کی عدالتیں کھول کے ہندوستانی عوام۔ کسانوں۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کے لئے امن و عافیت کی راہیں بند کر کے مستقل خطرہ اور عذاب کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔

انگریز مؤرخ ہووٹ کی روایت ہے کہ "حکومت ایک ایسا شکنجہ تیار کر رہی تھی جو عوام کو قرضوں میں جکڑ کر پھر ان کو قرضداری کے خلاف ڈگری دے کر سخت سزائیں دیتی۔ اس طرح چھوٹے بڑے سب جاگیرداروں کی جائدادیں رفتہ رفتہ ضبط ہوتی گئیں۔" اور یہ شکنجے سب انگریزی عدالتوں کے منصف جج تیار کرتے۔ ان عدالتوں میں کسانوں کے ساتھ جس قدر ظلم روا رکھا جاتا وہ حد درجہ تکلیف دہ تھا۔ اگر کسی شخص کے خلاف معمولی رقم مثلاً دو چار روپیہ کے مالیہ کا دعویٰ کسی عدالت میں پیش ہوتا تو جج مدعا علیہ کی کوئی شنوائی نہ کرتا۔ اور اس سے مالیانہ ادا نہ کرنے یا دیر سے ادا کرنے کا سبب دریافت کئے بغیر دعوے کی پہلی سماعت پر اس کے خلاف ڈگری دے دیتا۔ پھر ساہوکار جو غریب کسانوں کے لئے جونک بنے ہوئے تھے ان عدالتوں کے بل بوتے پر دُکھیوں کا خوب خون چوستے تھے۔ وہ غریبوں کو سود در سود کے عذاب میں مبتلا کر لیتے اور جب ان کے خلاف اپنے بے حساب قرضہ کا دعویٰ دائر کرتے تو جج قرضہ کی اصل رقم اور سود کی تفصیل معلوم کئے بغیر ساہوکار کے حق میں فیصلہ صادر کر دیتا۔ اور اس طرح بلا تحقیق و ثبوت لوگوں کی زمینیں اور جاگیریں نیلام ہو جایا کرتیں۔ ان تمام باتوں سے انگریزی حکمرانوں کے

خلاف ملک میں بددلی اور نفرت بڑھتی جارہی تھی - لیکن اعلیٰ حکام ان کے جذبات اور خواہشات سے قطعاً بے خبر تھے - اور عوام کو برابر طرح طرح کے شکنجوں میں جکڑ کر کچلے جارہے تھے، جس سے وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح اپنی حکومت کے تسلط میں ان کو کامیابی حاصل ہوتی جارہی ہے -

اگر کہیں کسی جبر وظلم کے خلاف کسی طبقہ کی طرف سے احتجاج ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح دبا دیا جاتا - لوگوں کے دلوں کے اندر نفرت کی دبی ہوئی چنگاریاں سُلگ رہی تھیں -

تشدد پر تشدد

۱۸۵۵ء میں حیدرآباد دکن کے قریب بُلارم کے مقام پر ایک ہنگامہ ایسا رونما ہوا جس سے انگریز حکمرانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں تھیں اس سے پہلے ۱۸۵۲ء میں دوسری جنگِ برما کے موقعہ پر انہوں نے دیسی سپاہ کے جذبات اور اپنے وقار کی غیر متزلزل حالت کا اندازہ بھی کرلیا تھا - بُلارم میں محرم کے موقعہ پر ایک ماتمی جلوس کے خلاف تشدد آمیز ناروا سلوک روا رکھنے کے سلسلہ میں کرنل کالون میکنزی کو ایک گھوڑ سوار مسلمان نے نہایت بیباکی سے قتل کر کے ثابت کردیا تھا کہ غیور مسلمان خصوصاً اور کُل ہندوستانی عموماً اپنے مذہبی و معاشرتی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت و بیجا سلوک کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتے اور ہر ایسے جبر و تشدد کو کچل ڈالنے کیلئے بلاخوف و خطر ڈٹ جاتے ہیں -

واقعہ یہ تھا کہ بریگیڈیر میکنزی نے اپنی کسی غلط فہمی کی بنا پر محرم کے جلوس سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ۲۰ ستمبر ۱۸۵۵ء کو چھاؤنی کے علاقہ میں ایک حکم امتناعی نافذ کر دیا کہ

"ہفتہ ۲۲ ستمبر کو بارہ بجے دوپہر سے اتوار ۲۳ ستمبر رات کے بارہ بجے تک کوئی جلوس نکالنا، باجا بجانا اور شور وغل کرنا ممنوع ہے۔ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا سخت سزا کا مستوجب قرار پائے گا۔"

اور اس کے بعد ہی دوسرے روز اس حکم میں ترمیم بھی شائع کر دی گئی۔ سبب یہ تھا کہ گورنر جنرل اور کونسل نے غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ چونکہ ۲۳ ستمبر کو یوم عاشورہ ہے۔ اس روز محرم کا ماتمی جلوس نکالا جانا لازمی ہے۔ اس لئے پہلا حکم غیر معمولی ہونے کے ساتھ انتہائی تشدد آمیز ہے۔ اور چونکہ یوم عاشورہ اور عیسائی سبت (اتوار) کے مابین اس حکم سے براہِ راست تصادم ہونے کا بھی اندیشہ ہے اس لئے بھی اس حکم کو غیر مآل اندیش قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ مذہبی امور میں یہ مداخلت نامناسب و بے جا ہے۔"

حکم مذکور الصدر کی تنسیخ کے باوجود اس کے اثرات عوام کے جذبات کو مشتعل کر چکے تھے۔ اور بریگیڈیر مذکور کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ دوسرے حکم کی اشاعت بھی ناکافی ہوئی۔ اس لئے اتوار کو عشرۂ محرم کے عام جلوس پر شاہراہوں میں سے گزرنے کی پابندی رکھی گئی۔

لیکن فوجی رسالہ کے دیسی سواروں نے اتوار کے روز حسب دستور قدیم ترمیم شدہ حکم کے مطابق صرف جلوس ہی نکال لینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس ممنوعہ علاقہ سے خاص طور پر گذرے جو بریگیڈیر کے بنگلہ کے پاس تھا جب اس کے سامنے جلوس پہنچا تو میکنزی چند انگریز افسروں اور میموں کے ساتھ باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ شوروغل کی آواز سن کر وہ غصہ میں آپے سے باہر ہوگیا۔ جلوس رُک گیا۔ اور ماتم کی آوازیں زور سے آنے لگیں۔ کرنل سے ضبط نہ ہوسکا اور دروازہ پر پہنچ کر اُس نے جلوس کو منتشر ہونے اور خاموش ہو جانے کا حکم دیا۔ مگر ماتم جاری رہا۔ اور مجمع اسی طرح اپنی جگہ جما رہا۔ اس پر افروختہ ہو کر وہ جھپٹا اور دو آدمیوں کے ہاتھوں سے عَلَم لے کر انہیں توڑ کر پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر کچھ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے چلاّ کر کہا کہ "یہ سڑک ہماری ہے۔ اس پر ہمارا بھی حق ہے"، اس کے بعد کچھ لوگ منتشر ہو گئے لیکن فوراً بعد کرنل پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اور راستہ سے گزرنے والے کئی انگریز مردوں اور عورتوں کو بھی مارا پیٹا گیا۔ اور خاصا ہنگامہ ہوتا رہا۔ بعد میں اس واقعہ کی تحقیقات کے دوران میں مسلمان سواروں نے اپنے بیان میں کرنل کارنیٹر سے کہا کہ

"ہم حکومت کے وفادار ملازم ہیں اور اس کے لئے اپنی جان نثار کرنے کو ہر وقت تیار ہیں لیکن ہمارا دین و مذہب ہماری جانوں سے زیادہ عزیز اور مقدس ہے۔ جس کے لئے ہم اپنا سب کچھ قربان کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی جذبات کی تذلیل اور دینی تقدس کی توہین کی گئی ہے"

اور جب افسروں نے انہیں ہتھیار رکھنے کے لئے حکم دیا تو انہوں نے کہا "ہم اپنی دینی مداخلت کے لئے حکومت سے باز پرس کریں گے۔ ہم اس وقت تک ہتھیار نہیں رکھیں گے جب تک بریگیڈیر اور بریگیڈ میجر کو فوجی عدالت کے سامنے نہیں لایا جائے گا۔"

اس کے بعد تحقیقات کے لئے فوجی کمیشن مقرر ہوا۔ لیکن بریگیڈیر سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔ بعد ازاں لارڈ ڈلہوزی نے رائے ظاہر کی کہ "بریگیڈیر کا عمل ناعاقبت اندیشی کا تھا۔"

عدالت کے فیصلہ کے مطابق تیسرے رسالہ کے تمام دیسی افسر باستثنائے دو افسران اور بریگیڈیر کے محافظ دستہ کے دو ہندو افسر برخاست کر دیئے گئے۔ جن کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے بلوائیوں کو حملہ کرنے سے روکنے اور بریگیڈیر کی حفاظت کرنے میں غفلت برتی۔

اس ہنگامہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان احکام کے نفاذ میں کس قدر بے اعتدالی روا رکھی گئی اور ہندوستانی عوام کے مذہبی جذبات سے کیسی لاپرواہی برتی گئی۔ اس سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ کس قسم کا ناروا سلوک روا رکھتے تھے۔ اور عموماً انگریز افسران اپنے ماتحتوں اور رعایا کے جذبات سے کس قدر ناواقف تھے۔ ورنہ ان کے دینی معاملات میں ایسی غفلت اور زیادتی کبھی گوارا نہ کرتے، جن کی بدولت حکومت کے انتظامی امور میں رخنہ اندازی ہوتی رہی اور حاکم و رعایا کے تعلقات ناخوشگوار ہوتے رہے۔ اور بظاہر اس سلسلہ میں کوئی مناسب اقدام نہیں

کیا گیا جس کے ذریعہ اہل ہند کے دلوں سے حاکموں کے خلاف مغائرت اور شک وشبہ کے احساسات میں کمی ہوتی۔ اور نہ رائے عامہ کی خوشگوار تربیت کا مناسب انتظام کیا گیا۔ بلکہ اس کے خلاف اس قسم کی مخالفت کی آگ پر تیل چھڑکنے کے غلط اقدامات کئے جاتے رہے۔

پادری ایڈمنڈ کا مذہبی وار

بلارم کے ہنگامہ کے کچھ ہی عرصہ بعد جبکہ لوگوں کے دلوں میں حکومت کی تمام حرکات اور اعمال سے شکوک وشبہات بڑھتے جا رہے تھے۔ بلادر ریل اور تار برقی کے اجرا نے ہندوستانی عوام میں بد دلی اور طرح طرح کے خطرے پیدا کئے تھے۔ اس سے اطمینان دلانے کی جگہ پادری ایڈمنڈ نے اسی سال ایک مراسلہ کلکتے سے جاری کیا جو ملک کے بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں خاص طور پر سرکاری حکام کے پاس بھیجا گیا۔ جس میں لکھا تھا:۔

> "وقت اور حالات کے فوری تقاضے کے مطابق رعایا کی طرف توجہ کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہندوستانی حکومت کا واحد مذہب اختیار کریں۔ ریلیں، دخانی جہاز اور برقی تار تیزی سے روئے زمین کی تمام قوموں میں اتحاد ویگانگت پیدا کرا رہے ہیں جس قدر جلد اور زیادہ قریبی اتحاد پیدا ہوگا۔ اتنا ہی انجام بخیر یقینی ہوگا۔ سب لوگوں کی ضروریات زندگی اور خواہشات میں یکسانیت اور غور

وفکر میں یکسوئی ہونی ضروری ہے اور اس لئے سب کی فطرت اور اصل ایک ہونی چاہیئے یہ بھی قطعی یقینی امر ہے کہ موت ہر ایک کا آخری انجام ہے - یہ مسئلہ عقلی دلائل سے حل کرنے کا ہے کہ ہر ایک قوم اپنے لئے ایک راہِ راست اختیار کرنے کے لئے محض قیاس کو رہنما بناتی ہے یا خدائے واحد کا سہارا، تلاش کرتی ہے جو سب کا خالق ہے جس نے مختلف طریقے حال و مستقبل کی مسرت حاصل کرنے کے لئے مقرر کئے اور اپنے مختلف خاندانوں میں انہیں تقسیم کیا -

ہندوستان میں اب ایک عملداری ہے - تار برقی اور ریلوے لائن کے ذریعے سب جگہوں کو ایک کر دیا گیا ہے - مذہب بھی ایک ہی ہونا چاہیئے - اس لئے آپ لوگوں کو مسیحیت کا ایک دین اختیار کر لینا چاہیئے ؟؟

اس خط نے ملک کے عوام و خواص سب میں سخت بے چینی اور اندیشے پیدا کئے حالات بدتر صورت اختیار کرنے لگے، اس کے باوجود حکومت کی سرگرمیاں اور بھی مخالفانہ رخ اختیار کرنے لگیں - جن کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا کہ سب کچھ رعایا کی بہبودی کے لئے ہے -

ریل گاڑیوں میں عام طور پر تمام لوگ ذات پات کے امتیاز کے بغیر ایک ہی نشست پر مل جُل کے بیٹھتے تھے - اونچی ذات کے براہمنوں کو نیچ

ذات اچھوتوں کے ساتھ ملکر بیٹھنا پڑتا۔ لمبے سفر کے دوران میں یا تو براہمن فاقے سے رہتے یا اپنی قدیم رسمیں توڑ کر سب کے سامنے کھاتے۔ اس سے انہیں مالی اور ذہنی دونوں طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچنے لگی اور اس میل جول سے ان کے شکوک کو تقویت پہنچی کہ لامذہب حاکم ان کو بے دین بنانے کے درپے ہیں۔ پادری ایڈمنڈ نے اپنے خط میں جو ظاہر کیا تھا کہ "

" ملک کے مختلف حصوں کو ریلوں اور تار برقی کے ذریعے ملا کر متحد کیا جا چکا ہے ۔ اور انگریزی تعلیم کے زیر اثر ایک ایسے معاشرے کی تنظیم کی جا رہی ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ تمام لوگ متفقہ طور پر ایک عقیدہ اور ایک مذہب کے ذریعے نجات کا واحد راستہ اختیار کر لیں۔"

اس قسم کی کھلم کھلا تبلیغ نہایت نامناسب تھی اور اس کی اعلانیہ اشاعت کو حکومت کے اشارے پر محمول کیا جانا یقینی تھا۔

رعایا کی بڑھتی ہوئی بے چینی کا اندازہ کر کے آخر کار لفٹیننٹ گورنر کو ایک عام اعلان کے ذریعے اس بات کی تردید کرنا پڑی کہ حکومت رعایا کے مذہبی معاملات اور رسم و رواج میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنا چاہتی۔ پادری ایڈمنڈ کے جاری کردہ مراسلہ کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں وہ اپنے خیالات کے خود ذمہ دار ہیں اور حکومت کی پالیسی سے ان کا کوئی اشتراک نہیں لیکن جو خدشات اور شبہات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے وہ اس اعلان سے دور نہ ہو سکے کیونکہ عوام کے نزدیک ہر انگریز حکومت سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔

اصلاحات یا جبر کے نئے شکنجے

اس واقع کے ایک سال بعد دو قوانین ایسے نافذ ہوئے۔ جنہوں نے کٹّر قسم کے قدیم خیال ہندؤں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی، لارڈ ڈلہوزی نے اپنے دورِ حکومت میں ہندؤں کی بیواؤں کی دوبارہ شادی کے قانون کا مسودہ تیار کیا تھا لیکن اس نے قانون کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ ۱۸۵۵ء کے اخیر میں جب لارڈ کیننگ گورنر مقرر ہو کر آیا تو اس نے اپنے زمانے میں سب سے پہلا قانون یہی منظور کیا جس سے تمام ہندؤں میں عموماً اور اعلیٰ ذات برہمنوں میں.... خصوصاً سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور اس قانون کو ان کے مذہبی مراسم میں بے جا مداخلت کا موجب قرار دیا گیا ممکن تھا کہ عوام کی ناراضی کی وجہ سے ستی کی بندش کے قانون کی طرح اس قانون کو بھی مسترد قرار دیا جا سکتا لیکن ایک بنگالی ہندو عالم ایشور چنڈر ودّیا ساگر نے اس اصطلاحی تنظیم کے حق میں تائیدی بیان دیا اور اپنی قدیم مذہبی کتابوں سے حوالے دے کر بیوہ گان کی شادی جائز اور ضروری قرار دینے کی پُر زور حمایت کی اسطرح حکومت کو اس قانون کے نفاذ میں پوری مدد ملی ساتھ ہی بہت سی نوجوان ہندو بیواؤں نے اپنی موجودہ عذاب انگیز زندگی کا علاج سمجھ کر خوشی سے قبول کیا۔ کئی علاقوں میں نوجوان بیواؤں کی شادی ہو گئی اور اس طرح یہ قانون عملی طور پر نفاذ پا گیا مگر ہندؤں نے اپنے حق میں ایک غیر مذہبی لعنت سمجھا حالانکہ یہ ایک معاشرتی اصلاح کا موجب مانا جاتا تھی۔

خصوصیت سے برہمن اپنے مذہب میں رخنہ اندازی اور عیسائی حکومت کی ظالمانہ حرکت سمجھتے تھے۔ اور سر سید احمد خان کے قول کے مطابق وہ اس قانون کو :-

"باعث اپنی ہتک عزت اور بربادی خاندان کا جانتے تھے اور یوں بدگمانی کرتے تھے کہ یہ ایکٹ اس مراد سے جاری ہوا ہے کہ ہندو کی بیوائیں خود مختار ہو جائیں اور جو چاہیں سو کرنے لگیں۔"

دیہات اور دیسی فوجوں میں ان تمام باتوں کے سبب انگریزی حکومت ہندوستانیوں کے لئے "مذہب کا ہوّا" مشہور ہو گئی۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد اسی سال ایک فوجی ضابطے کے ماتحت اُن بنگالی عوام پر ایک وار ہوا جو بنگالی فوجوں میں بھرتی ہوئے تھے۔ اس سے پہلے دو مرتبہ برما کی لڑائی کے زمانے میں بنگال کی فوجوں نے سمندر پار سفر کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آخری مرتبہ لارڈ ڈلہوزی کے زمانے میں ان کو معافی بھی دی گئی تھی۔ لیکن لارڈ کیننگ نے فوجوں کے اس روّیے کو سرکاری احکام کی خلاف ورزی اور فوجی حکم عدولی سمجھ کر اس کا تدارک کرنا مناسب سمجھا اور ضابطہ مقرر کر دیا کہ بنگالی فوجوں میں بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کے ساتھ کسی قسم کی شرط یا رعایت روا نہیں رکھی جائے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب ان تمام فوجوں کے سپاہیوں کو بھرتی ہونے کے وقت یا تو اپنی مذہبی اور قومی روایت کو خیر باد کہنا پڑتا تھا۔ جس سے اپنی روزی کمانے

کے لئے بے دین بن جاتے یا دین دھرم کا لحاظ کر کے بے روزگار رہتے اور فاقے کرتے پھر جو لوگ اس نئے ضابطے کے ماتحت اپنی قومی اور مذہبی رسم ورواج توڑ پھوڑ کر فوج میں بھرتی ہوئے ان میں سے جس فوج کو کچھ عرصہ بعد جاوا کے مقام پر بغاوت دور کرنے سمندر پار لے جایا گیا۔ وہ اس وعدے پر گئے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد انہیں واپس بلا لیا جائے گا بہ مدت گزرنے کے بعد وعدے کی خلاف ورزی کی گئی اور انہیں غیر معینہ مدت کے لئے وہاں رہنا پڑا۔

غرضیکہ اصطلاحات کا نفاذ اور عیسائیت کی تبلیغ میں شدت اور سب سے بڑھ کر دیسی سپاہیوں کی دینی مداخلت نے ایک طرف انگریزی حکمرانوں کے خلاف عوام میں بے زاری اور بدظنی بڑھائی اور دوسری طرف ہندوستانی سپاہیوں کے دلوں میں اپنی نئی حکومت کے لئے اعتماد اور وفاداری کے جذبات کا خاتمہ کر دیا۔

گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں انگریزوں کی طرف سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مسلسل اپنے حاکمانہ اقتدار اور استحکام کی خاطر ایسی بدعنوانیاں اور زیادتیاں ہوتی گئیں جن کے خلاف ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہوتی رہی اور انہوں نے کمپنی کی حکومت کو نہ صرف اپنے قومی وقار کے منافی سمجھا بلکہ وہ اس کے ہر طرز عمل اور ضابطے وقانون کو اپنے ملک وملت اور دین ومذہب کا دشمن سمجھنے لگے اور اک ایسے جابر حاکم کی غلامی کو اپنے اُوپر مسلط ہوتے دیکھنے لگے جس میں ان کے لئے امن چین سماجی اطمینان اور مذہبی آزادی کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

اقتصادی بدحالی اور افلاس

یہ وہ عام حالت تھی جو کمپنی کے دورِ حکومت میں سارے ملک میں پھیلی نظر آتی تھی اور ان خرابیوں اور تکلیفوں کے علاوہ جگہ جگہ وبائی امراض کی کثرت افلاس اور بے روزگاری کا دور دورہ بھی زوروں پر تھا مختلف خرابیوں نے ملک میں اقتصادی بدحالی بھی عام کر دی تھی جس کا نقشہ انگلستان کے مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں یہ تھا:-

"ذرا اس نازیبا معاشرے کا تصور کرو جس کا نقشہ ولسن ٹارٹ نے کھینچا ہے - وہ بتاتا ہے کہ انگریز من مانے نرخوں پر دیسی باشندوں کو خرید و فروخت کے لئے مجبور کرتے تھے ورنہ انہیں تازیانے یا قید کی سزا دی جاتی تھی - وارن ہیسٹنگز نے ایک سفر کے جو حالات بیان کیے ہیں - انہیں سامنے رکھ کر خود اندازہ کرو کہ حالت کس درجہ ابتر ہو چکی تھی وہ کہتا ہے کہ ہمارے پہنچنے سے پیشتر بہت سے چھوٹے چھوٹے قصبے اور سرائیں خالی ہو چکی تھیں - بے دردانہ بدعہدی حکام کی مسلّمہ پالیسی تھی امیروں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑائی پر آمادہ کر دیا جاتا......... جن امیروں نے انگریزوں کا سہارا قبول کر لیا تھا ان کے قبضے میں حرص افروز خطّے تھے - ان سے خراج کی بھاری رقمیں لے کر پہلے مفلس بنا دیا گیا - جب وہ مطالبات پورے کرنے کے قابل نہ رہے تو سمجھا گیا کہ وہ غداری

کے مرتکب ہو رہے ہیں اور سزا میں انہیں مسند سے اتار دیا گیا...
ہمارے زمانے تک یہ ہو رہا ہے کہ نام نہاد شرفاء ہاتھیوں پر سوار ہو کر غریب کسانوں کی فصل میں سے گزرتے ہیں اور رسد کے طور پر دیہاتیوں سے جو لیتے ہیں اس کی قیمت ادا نہیں کرتے ہمارے زمانے تک یہ ہو رہا ہے کہ اندرونِ ملک کے لوگ فرنگی کی شکل دیکھتے ہی جنگلوں میں بھاگ جاتے ہیں۔"

اور اس بیان کی تصدیق سر سید احمد خان کے الفاظ میں بھی ہوتی ہے کہ ۔۔ "انگریزوں کی عملداری کا ابتدائی دور دونوں کے حق میں ساز گار نظر آتا تھا۔ پہلے سال میں حکومت کی مقبولیت عام تھی۔ اور رعایا انگریزوں سے بہت مانوس تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ اثر زائل ہوتا گیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو اور ہندوستانی انگریزوں کو نفرت سے دیکھتے ہیں۔"

ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزوں کا خوف، نفرت کے ساتھ بڑھتا گیا اور متذکرہ بالا اسباب کی بنا پر لوگ حکومت سے بیزار ہوتے گئے۔ انگریز ہندوستانی کو "کالا آدمی" کہہ کر حقارت سے دیکھتا۔ معزز اور قابل ترین ہندوستانی پر ایک ادنیٰ انگریز بلکہ دیسی عیسائی کو بھی ہر معاملہ میں ترجیح دیتا۔ ہندوستانی کسان اور زمیندار نئے نئے ضابطوں اور سختیوں کے سبب ہراساں ہوتے جا رہے تھے۔ ضلع کے افسروں کے سلوک سخت ناروا تھے۔ عدالتوں اور دفتروں میں رشوت کی گرم بازاری تھی۔ بنیے ساہوکار غریب کسانوں کا خون چوستے۔ ان کی زمینوں اور سامان کو رہن رکھ کر قرض کی جکڑبند میں

باندھتے جاتے اور عدالتیں بنیوں سے رشوتیں لے کر غریبوں کے خلاف سود در سود کی بھاری ڈگریاں دیتی رہتیں۔ اسی زمانہ میں ایک ظالمانہ قانون زمینوں اور مولیشیوں کی فروخت کا بھی نافذ ہؤا جس نے دیہات میں کسانوں کے لئے نئی مصیبتیں توڑیں۔ ساہوکاروں کے جھوٹے دعوؤں پر بھی ہر کسی عدالت سے کسانوں کے خلاف ڈگری ہو جاتے پر غریبوں کی موروثی زمینیں اور مولیشی نیلام کر دئے جاتے۔ اور ساہوکار خود انہیں قرضہ کے عوض خرید کر کسانوں کو ان کے وارثوں سے محروم اور بے دخل کر دیتے۔

رابرٹسن (ضلع سہانپور کا مجسٹریٹ) ایک بیان میں لکھتا ہے کہ "کاشتکار طبقہ میں ہمارے خلاف ساہوکاروں کی طرفداری کے الزامات عام ہونے کے سبب حد سے زیادہ نفرت اور بیزاری پائی جاتی تھی۔ اور کسان اپنے موروثی حقوق چھن جانے کے سبب بنیوں کو جتنی بُری نظروں سے دیکھتے تھے اس سے زیادہ ہم سے بیزار تھے۔ کیونکہ ہماری عدالتوں کے فیصلوں نے ساہوکاروں کو زمیندار بنا کر ہمیں ان کی نگاہوں میں ظالم بنا دیا تھا۔"

دیہات میں افلاس اور فاقہ کشی کا دور دورہ ہونے لگا تھا۔ اور یہ سلسلہ بہت مدت سے جاری تھا۔ جو رفتہ رفتہ بڑھتا ہی رہا۔ اور حکومت کا مقصد کسانوں کی آبادی کی کثرت کو مفلوک الحال اور فاقہ کش بنا کر تبدیل مذہب پر آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ سرسید احمد خان نے بیس سال پہلے کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:-

"۱۸۳۷ء میں جن دیہات میں قحط اور وبا کا زور ہؤا وہاں غریب

کسانوں کو اس شرط پر کھانا، کپڑا اور دوائیں دی گئیں کہ وہ اپنے اپنے دین دھرم چھوڑ کر عیسائی بن جائیں۔ جو کمسن بچے اس وبا میں یتیم ہو کر عیسائی یتیم خانوں میں داخل کئے گئے وہ سب عیسائی بنائے گئے۔"

ان وجوہ کے ساتھ انگریز اور ہندوستانی میں رنگ کی تفریق نے بھی ہند کے عوام و خواص سب کی عام تذلیل کی۔ ملازمتوں میں بڑے عہدوں کے مالک صرف انگریز تھے اور پھر ان کے بعد دیسی صاحب لوگ (یعنی ہندوستانی عیسائی)

سرکاری ملازمتیں اور ہندوستانیوں کی حق تلفی

گو ہندوستان کے باشندوں میں تعلیمی لحاظ سے معقول تعداد میں اعلیٰ عہدوں کے لائق لوگ موجود تھے۔ لیکن ان میں سے بڑے سے بڑے عہدے پر ڈپٹی کلکٹر یا صدر امین تک لئے جاتے اور باقی سب انگریز تھے۔ جو اس ملک کے حاکم بن چکے تھے۔ ملک میں وہ سارے معزز خاندان موجود تھے۔ جن کے آباؤ اجداد اپنے ملک کے نظام میں اعلیٰ ترین عہدوں پر معمور چلے آتے تھے اور قومی اور ملکی حکومت میں برابر کے شریک تھے۔ فوجوں میں سالار اور بڑے بڑے سردار رہے تھے۔ ضلع، تحصیل، پولیس اور شہری انتظام کے تمام محکموں میں وہی حاکم ہوتے۔ وزارتوں کے عہدے وہی سنبھالتے اور اب ان کے خلاف دربدر ادنیٰ ملازمتوں کے لئے دھکے کھاتے، بے روزگاری کے مصائب برداشت کرنے پر مجبور تھے یا ہزار سفارشوں اور خوشامدوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ معمولی کلرک بھرتی کر لئے جاتے۔

یا معدودے چند ماتحت افسر بنا دیئے جاتے، ان میں سے با اختیار حاکم کوئی بھی نہ تھا۔ اس طرح ہر ہندوستانی کے سامنے غلامی کا بڑھتا ہوا طوفان تھا۔ اور انگریزی حکومت کا عقاب تشدّد اور تذلیل کے پر پھیلائے چھایا جا رہا تھا ایک غیر جانبدار انگریز رسّل اپنی کتاب "میری ہندوستانی ڈائری" میں لکھتا ہے کہ "ہر ہندوستانی ہماری قوم کے حاکموں اور ان کی بداعتدالیوں اور غفلتوں کے باعث ذلّت وخواری کا شکار تھا۔ ان کے دلوں میں ہمارے لئے محبت اور پسندیدگی کے جذبات کیونکر پیدا ہو سکتے تھے، ہم نے ان کا سب کچھ چھیننا شروع کر دیا تھا۔ اس ملک کی آبادی کی کثرت ہمارے اس ناروا سلوک کے بدلے اگر ہم سے بیزار اور متنفر نہ ہوتی تو باعث حیرت تھا"

زمینداروں اور کسانوں سے بدسلوکی

اکثر انگریز افسروں کے بیانات ان کی یادداشتوں اور رپورٹوں میں ملتے ہیں جن سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بدعنوانیوں اور بدنظمیوں کا پتہ چلتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں ملک کی فضا کتنی مسموم اور اہل ہند کے حق میں حالات کتنے ناسازگار اور تکلیف دہ ہو گئے تھے۔

تھارن ہل، جو اس زمانہ میں متھرا کا کلکٹر تھا اپنی "یادداشت" میں لکھتا ہے کہ:-

"کمپنی کے زمینداری اور لگان کے نئے ضابطہ کے ماتحت نوجوان اعلیٰ حکام کو اپنی کارگزاری دکھلانے کی غرض سے بڑے بڑے زمینداروں کو

تنگ کرنے کے موقعے دئے ۔ لگان بے اندازہ وصول کئے جاتے جو عموماً زمیندار ادا نہ کر پاتے ۔ فصل اچھی ہوتی تو تھوڑا بہت ادا کر سکتے اور بُری فصل میں تباہ ہو کر رہ جاتے ۔"

ولیم ایڈورڈز کلکٹر و مجسٹریٹ بدایوں نے جنگ آزادی کے دوران میں اس قسم کے بیانات کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے ایک زمیندار دوست کے بارے میں کہا ہے کہ

"اس بیچارے کو اپنی زمینداری اور جاگیر برقرار رکھنے کے لئے ہزاروں روپیہ کورٹ فیس کے طور پر خرچ کرنا پڑا اور چھ ہزار روپیہ سے زائد رشوتوں پر صرف کیا ۔ پھر بھی اپنے آباؤ اجداد کی کمائی ہوئی جاگیر کو محفوظ نہ رکھ سکا ۔ زمینیں اور خاندانی زیورات بیچ ڈالنے کے باوجود اپنا حق نہ پا سکا ۔ جس سال غدر کی ابتدا ہوئی اس کو لگان کی بھاری رقم ادا کرنا تھی لیکن غدر اس کے حق میں نعمت ثابت ہوا ۔"

کرسچین جو اس زمانہ میں اپنے صوبہ کا مقبول کمشنر تھا ۔ ان تمام امور کا اندازہ کر کے انہیں ماننے پر مجبور نظر آتا ہے ۔ اور بیان کرتا ہے کہ

"غدر بہت سے زمینداروں کے حق میں نجات کا پیام ثابت ہوا ۔ لگان اور تاوان کی غیر معمولی رقمیں جو اُن کے حق میں بارِ عظیم اور عذاب الیم بنی ہوئی تھیں ، ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال بڑی حد تک اطمینان کا باعث تھا ۔ بڑے تعلقدار اور زمیندار جو سالہا سال سے موروثی جاگیروں کے مالک تھے معمولی پنشن خوار اور بے دست و پا نظر آنے لگے تھے ۔"

تھارنٹن بھی اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ :-

"امراء و رؤساء اپنی شان و شوکت کھو کر معمولی وثیقہ دار بن گئے۔ اور اس زمانہ میں اگر کوئی طبقہ آرام و سکون سے تھا تو وہ بنیوں، ساہوکاروں کا تھا۔"

اور ان حالات کا جائزہ لینے کے بعد خود انگریز افسروں کے مصدقہ بیانات کی روشنی میں سر سید احمد خان نے بجا فرمایا ہے کہ

"ان تمام باتوں سے کمپنی کے حکام کا ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستانی شرفاء کو کمزور، بیکار اور درماندہ و پست حال بنا کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے۔"

اور ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے اوراق پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں جن سے ثابت ہو چکا ہے کہ کمپنی کی حکومت ابتدا سے ہندوستانیوں کو ہر طرح لوٹنے اور ذلیل و خوار کرنے میں مصروف تھی۔

ہندوستانی سپاہیوں کی بد حالی

فوج میں زیادہ تعداد ہندوستانی سپاہیوں کی تھی جن کی بدولت کمپنی بہادر سارے ہندوستان کی مالک بننے کے لائق ہوئی تھی۔ اور تمام فتوحات انہیں کے ہاتھوں حاصل کر رہی تھی۔

فوجوں میں انگریزی اور دیسی سپاہیوں کا تناسب یہ تھا کہ کل افواج میں ۵۲۰ د ۳۱۵ افراد شامل تھے۔ جن کے مصارف کا اندازہ ۹۸۰۲۲۳۵ پونڈ سالانہ تھا۔ ان میں ۲۱۶ د ۵۱ انگریز افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہ

پر کل مصارف میں سے ۵۶,۶۸۱۱۰ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ باقی سپاہ کثیر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی جنکی کل تعداد ۲۶۳۱۲۳ تھی اوران پر صرف ۳۱۳۱۲۵ ۲ پونڈ سالانہ خرچ کیا جاتا۔ اس کے علاوہ انگریز سپاہیوں کو ادنیٰ 'خدمات پر کبھی مامور نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے قیام، خوراک اور تنخواہوں کا اندازہ دوسرے دیسی سپاہیوں کو قطعاً نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس امتیازی سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی سپاہیوں میں بددلی پیدا ہونے لگی۔ ایک طرف مذہبی تبدیلی کا خطرہ ان کے سامنے تھا۔ دوسری طرف مشاہرہ قلیل اور خدمات بے حد شدید، یہ حالت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکتی تھی۔ چونکہ دیسی سپاہی کی ضروریات محدود تھیں اس لئے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس کی قلیل تنخواہ میں اس کی گزر بسر آسانی سے ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ اس حالت میں ممکن تھا کہ وہ اپنی کل تنخواہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لائق ہوتا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ ایک سپاہی فوج میں بھرتی ہونے کے بعد ابتدائی چند مہینے تک اپنے چھوٹے افسروں کی خاطر مدارات اور ان کو تحفہ تحائف نذر کرنے پر خاصی رقم خرچ کرنے پر مجبور کیا جاتا۔

بنگال آرمی کا ایک ہندو صوبیدار سیتا رام جس کا بیٹا فوجی بغاوت میں شریک ہو کر پیش پیش رہا اس زمانے کی تکالیف اور دیسی سپاہیوں سے عام بدسلوکی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ

"فوج میں بھرتی ہونے کے بعد سپاہی کی حیثیت سے جو حوالدار ہمیں قواعد سکھاتا ہے مجھے شروع میں بے حد خفا رہا اور جب تک میں نے مقررہ

نذرانہ ادا نہ کیا اس کی خفگی دور نہ ہوئی۔"

نذرانے کی مقررہ رقم سولہ روپیہ تھی۔ اس میں سے پانچ، چھ روپے اس انگریز سارجنٹ کی نذر کئے جاتے۔ جس کی پلٹن میں یہ رنگروٹ شامل ہوتا۔ سیتارام اور دوسرے تمام دیسی سپاہی۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ سبھی اس سلوک کے عادی بنائے جاتے اور انھیں اِن مشکلات کے ساتھ کمپنی کی حکومت سے وفاداری کا عہد کر کے اس کی عملداری بڑھانے اور اپنے ملک کو غلام بنانے کے لئے اپنا خون بہانا پڑتا۔ جس کے لئے وہ سب مجبور تھے۔ سیتارام کے خاندان کے متعدد افراد فوج میں شامل تھے۔ اس کا چچا جمعدار تھا۔ وہ خود بھی حوالداری کے عہدے پر ترقی کر گیا۔ اور ان سب نے اپنی اور خاندان کی پرورش کی خاطر یہ سختیاں جھیل کر کمپنی سے وفاداری کا عہد نباہا۔ لیکن اس کا بیٹا سپاہی بھرتی ہوا اور ان تکالیف کو برداشت نہ کر سکا۔ آخر اپنے ہم قوم سپاہیوں کا ہمنوا بن کر وطن دوستی کے لئے بغاوت پر آمادہ ہوا۔ اور یہی حال ان سب سپاہیوں کا تھا جو جنگ آزادی میں شریک ہو کر غیر ملکی مظالم کے خلاف سینہ سپر ہوئے۔ سیتارام کا بیان ہے کہ سات روپیہ ماہوار کا قلیل مشاہرہ ایک سپاہی کی ضروریاتِ زندگی کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ افسروں کا سلوک حد سے زیادہ ناروا اور تکلیف دہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ایک سوار رسالہ متعینہ بریلی کے ایک کلرک کی زبانی معلوم ہوا کہ:۔

"ہندوستانی سپاہی کو اپنی وردی کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جب اسے تنخواہ ملتی تو وردی کی رقم اور راشن کے سلسلے میں

چھاؤنی بازار کے بنیے کا قرض ادا کرنے کے بعد عموماً اس کے پاس ایک روپے، ڈیڑھ روپے سے زائد باقی نہ رہتا۔ اس کی خوراک صرف دال روٹی تھی۔ اس کی تنخواہ سات سے نو روپیہ ماہانہ تک تھی جس کے عوض اسے سخت سے سخت مشقت اور جانبازی کے فرائض انجام دینا ہوتے، یہ تو پیدل پلٹن کے سپاہی کا حال تھا۔ اور سوار سپاہی کو اکیس ۲۱ سے تیس ۳۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی۔ اس میں اسے گھوڑا بھی خریدنا ہوتا اور بہت سی منہائی اور کٹوتی بھی ہوتی۔ اور اس کے مقابلے میں آرام و آسائش کی زندگی گزارنے والے انگریز سپاہیوں کو بے اندازہ مراعات اور مشاہرہ ملتا۔ یہ حالات دیکھ اور سمجھ کر دیسی افواج میں بغاوت کے جذبات پیدا ہونا یقینی تھے۔

اس حالت کی تصدیق کے لئے سر ہنری لارنس کا ایک خط ہمارے سامنے ہے جو اس نے ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو لارڈ کیننگ کے نام لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"گذشتہ رات اودھ کے توپخانے کے ایک جمعدار سے میری گفتگو ہوئی۔ اس کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ کر کے حیرت ہوئی کہ ان لوگوں کے دلوں میں کب سے ہمارے خلاف نفرت اور بددلی کے جذبات و خیالات پرورش پاتے رہے ہیں اور وہ انھیں کس طرح دلوں میں چھپائے جبراً و قہراً ہماری خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اس جمعدار نے مجھے بتایا کہ دیسی سپاہیوں کے دلوں میں یہ بات اب اچھی طرح گھر کر چکی ہے کہ انگریز دس سال سے ہمیں غلام بنانے میں مصروف، طرح طرح کی زباں‌ذنیاں کر رہے ہیں۔ ہمارے مذہب کی تبدیلی کے بھی درپے ہیں۔ جب میں نے اسے اپنی یورپ کی حالت اور حکومت کی طاقت کا حال بتایا

تو اُس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کے قبضے میں بے اندازہ دولت اور فوجی قوت ہے۔ لیکن انگریز سپاہی پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور اسی لئے آپ لوگ ہندوؤں کو سستے داموں سمندر پار لیجا کر ساری دنیا کو ان کے بل بوتے پر فتح کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا منشا ہے کہ ہمارے دھرم کی پروا کئے بغیر جو چاہیں ہمیں کھلائیں پلائیں۔ اور جہاں چاہیں اپنی عملداری بڑھاتے لے جائیں، یہ جمعدار مجھے اکثر کہا کرتا ہے کہ جو کچھ میں آپ سے کہتا ہوں یہ میرا بیان نہیں ہے۔ دیسی فوج کے ہر سپاہی کی زبان پر یہی ہے۔"

ابتدائی حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز تاجروں نے شروع میں ہندوستانیوں سے دوستی اور میل جول کا سلوک کیا اور اپنی فوجوں میں ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لئے بھی بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ پہلے وہ ان سپاہیوں کی بڑی بڑی خاطر مدارات کرتے۔ انھیں انگریز افسروں سے ملنے جلنے اور ان کے کوٹھیوں بنگلوں پر جانے ان کے ساتھ ناچ رنگ کھیل کود میں شریک ہونے کی عام اجازت تھی۔ رفتہ رفتہ جب اس میل جول سے انھوں نے اپنی فوجی قوت بڑھائی اور استحکام کے انتظام کر لئے تو ہوتے ہوتے وہی انگریز افسر بڑے صاحب بن گئے اور دیسی سپاہی بلکہ افسر تک "کالا آدمی" کہلانے لگے۔

کالا آدمی کو "بڑے صاحب" کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی سپاہی کسی "صاحب" کی کوٹھی پر پہنچ جاتا تو وہ اس کی شکل دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتے اور غصہ و نفرت سے منہ پھیر لیتے کہ اس حقیر غلام کو ان کے

"درِ دولت" تک پہنچنے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ اور سب سے بڑا سبب فوجی بغاوت کا یہی تھا کہ دیسی فوج انگریزوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ فوج کے علاوہ ہندوستانی عوام و خواص سبھی کو اس کا بجا احساس ہو گیا کہ انگریز اسے "کالا آدمی" کہہ کر اس سے حد درجہ حقارت کرتا ہے۔ لفٹنٹ ورنے کا بیان ہے کہ:۔

"ہندوستان میں بغاوت کے اسباب میں سے اہم سبب یہ بھی ہے۔ کہ ہر انگریز کے دماغ میں ہندوستانیوں سے نفرت اور تعصب پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ انھیں گری ہوئی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اگر کوئی انگریز کسی ہندوستانی سے کسی معاملے میں رعایت برتتا یا اس سے مہربانی کا برتاؤ بھی کرتا تو اس کے انداز میں حقارت اور برتری کا کھلم کھلا اظہار ہوتا اور یہ باتیں ہمارے عام سلوک میں روزمرّہ نظر آتی تھیں۔ ایک پادری تک اسی انداز سے ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ کرتا دکھائی دیتا۔ اور اس لئے ہندوستانی ہم لوگوں کو بالکل غیر سمجھنے لگے جس کے لئے وہ حق بجانب تھے۔"

جبر و بدنظمی کے خلاف منافرت

اہلِ ہند کے ہر طبقے نے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ انگریز قوم مٹھی بھر تھی۔ وہ تاجروں کی جماعت بن کر ہمارے وسیع و عریض زرخیز ملک میں آئی۔ اس کی اپنی فوج کے معدودے چند آدمی تھے جو ہمارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی حسنِ سلوک سے جو قطعی عیارانہ تھا، ہمیں اپنے

گروہ میں شریک کیا۔ ہمارے دیس کی فوجوں سے ہمارے ملک کو فتح کرنے میں مصروف رہے۔ اور ہمارا دین، دھرم، رسم و رواج، زبان اور قومی شعار سب کچھ چھین کر ہمیں غلام بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ فوجی نظام۔ ملکی بندوبست، تعلیمی ادارے۔ سب کچھ اب انھوں نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ میں دیدیئے ہیں۔ اور وہ ہم سے جبر و سختی کا سلوک کرتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے دروازے بھی ہندوؤں مسلمانوں پر بند کر رکھے ہیں۔ ہندوستانی صرف ادنیٰ کلرک بننے کے لائق ہیں یا فوج میں سپاہی اور معمولی جمعدار، حوالدار بن سکتے ہیں۔ حاکمانہ وقار صرف انگریزوں کے لئے ہے۔

ہندوستانی نوابوں اور راجوں کی جاگیریں بھی ضبط ہو رہی ہیں۔ اور شہروں، گاؤں پر بھی ان کا ہر طرح قبضہ ہوتا جا رہا ہے وہ وقت قریب ہے۔ کہ ہم سب ان کے غلام بن کر ذلت و خواری اور بے روزگاری کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں

اور جب یہ حقیقت ظاہر ہو چکی تھی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ ہندوستان کا بچہ بچہ انگریز کو نفرت سے نہ دیکھتا۔ چنانچہ سر ڈبلیو ایچ رسل نے "میری ڈائری" (۱۸۵۸-۵۹ء کے دوران ہندوستان میں) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ

"میں نے بنارس کے علاقے سے گزرتے ہوئے شہر اور دیہات کے ہر مقام پر جن لوگوں سے ملاقات کی یا انھیں دیکھا ان کی باتوں اور نگاہوں

سے انگریز کی صورت سے انتہائی حقارت اور نفرت ٹپکتی تھی۔ میں نے اس سے اندازہ کیا کہ ہماری قوم سے ہندوستانی عوام محض خائف ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں شدید غصّے اور نفرت کے جذبات موجود ہیں۔ اور اس کا سبب ہماری بدسلوکی اور بدعنوانی تھی جو ہم نے غفلت سے ان کے ساتھ روا رکھی۔ ہم نے ناانصافی سے انھیں اعلیٰ عہدوں کے قابل نہ سمجھا۔ ان کے باپ دادا کے رتبوں اور جاگیروں سے انھیں محروم کیا۔ ظاہر ہے کہ اس ظلم و تشدد کے بدلے وہ ہم سے دوستی کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔"

رسل آگے کہتا ہے کہ "اس کے مقابلے میں جب اودھ کے الحاق کے بعد غدر چھڑ جانے کے دوران میں سلطانِ اودھ کے بیٹے برجیس قدر نے شاہی اعلان میں ہندوستانیوں کے ان ضبط شدہ اختیارات کو بحال کرتے ہوئے ان الفاظ میں ہمارے ناروا سلوک کو بے نقاب کیا کہ

"تمام ہندو اور مسلمان اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ انسان کے لئے دنیا میں چار چیزیں بہت عزیز ہیں۔ اول ایمان۔ دوم عزت۔ سوم جان۔ چہارم مال۔ یہ چاروں چیزیں صرف قومی و ملکی حکومت کے تحت محفوظ رہتی ہیں۔ غیر ملکی اقتدار نے ان چاروں چیزوں کو ہندوستانیوں سے چھیننے کے لئے ہر ممکن جبر و ظلم روا رکھا۔ مساوات کا پُرفریب اعلان کر کے انگریزوں نے ایک ادنیٰ ذات کے چمار اور ایک معزز اعلیٰ ذات کو برابری کا درجہ اس لئے دیا کہ تمام ہندوستانی ذلیل و خوار ہوں کیونکہ وہ نیچ ذات ہندوستانیوں بلکہ ہر عام و خاص کو گری ہوئی نظروں سے دیکھتے اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ اس سے

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ہندوستانیوں کے ایمان، عزت اور جان و مال پر قابض ہو کر ان کا سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔"

جوڑ توڑ کی حکومت کا خلاصہ

مختصر یہ کہ اس دور کی عام سیاسی فضاء اور ملکی حالات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریز تاجروں نے ہندوستان میں قدم رکھکر دوستی کے پردے میں ہر ممکن عیاری اور فریب سے کام لیا۔ ابتدا میں انھوں نے کبھی کسی قوت کا مقابلہ قوت سے نہیں کیا، عہدنامے کئے۔ اپنے مطلب کے لئے دوست کا بہروپ اختیار کیا۔ جہاں دوستی سے اپنا مفاد دیکھا وہاں خوشامد اور میل جول کا برتاؤ کیا۔ جہاں دشمنی کا موقع مناسب سمجھا وہاں دوستی کے پردے میں دشمنی کی۔ طاقت کے سامنے چاپلوسی سے جھکا کر اُسے عیاری سے زیر کرنے کی کوشش کی، جسے کمزور پایا اس کا سر دبایا۔ طاقتوروں کا سر دوستی کے پردے میں سہلایا۔ اور ان کا بھیجا کھایا۔ اور یہ سب کچھ تجارت کے پردے میں کرتے رہے۔ لیکن ان تاجروں میں سیاست داں بھی تھے۔ مدبر بھی۔ کارگزار حکمران بھی اور مجبر سپاہی بھی۔ اپنی ان عجیب و غریب فطرتی چالوں سے انھوں نے ہندوستان جنت نشان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ کہیں مرہٹوں سے آویزشیں کیں اور سیاسی توڑ جوڑ سے انھیں قابو میں کر کے ۱۸۱۶ء میں فتح پائی۔ باجی راؤ پیشوا کو بٹھور میں گنگا کے کنارے کانپور سے سولہ میل دور بھیج دیا۔ اور تیس لاکھ سالانہ پنشن مقرر کر دی۔

اس کے بعد لارڈ ولزلی باجی راؤ کے بھائی امرت راؤ کی پنشن سات لاکھ سالانہ مقرر کرکے اسے بنارس میں رہنے کے لئے مجبور کیا۔ ان دونوں بھائیوں سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے معاہدہ کیا تھا کہ ان کا یہ وثیقہ اور پنشن ان کے بعد ان کے وارثوں کو بھی ملتی رہے گی۔ لیکن باجی راؤ کی وفات کے وقت جب اُس نے اپنے متبنیٰ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تو کمپنی کے حکام نے صریحاً اس عہد نامے کی خلاف ورزی پر کمر باندھ لی اور پیشوا کے متبنیٰ نانا راؤ کی عمر اس وقت ستائیس برس کی تھی۔ وہ نہایت ہوشیار نیک چلن نوجوان تھا۔ اور کسی بُری عادت میں نہ پڑنے پایا تھا۔ وہ ہر طرح انگریزوں کا وفادار تھا۔ پیشوا نے اپنی ساری بقیہ عمر نہایت وفاداری سے بسر کی تھی۔ وہ کمشنر کے صلاح مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔

اسی کمشنر نے جس نے عمر بھر اس سے دوستی کے تعلقات کا اظہار کیا تھا۔ نانا راؤ کو اس کا وارث ماننے کیلئے گورنر جنرل سے سفارش کی مگر حکومت نے تجویز مسترد کرکے تیس لاکھ کی پنشن سے محروم کر دیا۔ جو تعلقہ پیشوا کو ملا ہوا تھا۔ اس کا انتظام رام چندر پنت کے سپرد تھا۔ حکومت سے نانا راؤ کی وکالت کرتا رہا کہ پنشن منظور کرلے۔ لیکن گورنر جنرل نے کمشنر اور وکیل کے ذریعے سے اپنی پالیسی واضح کی کہ نانا راؤ کا بھٹور میں رہنا حکومت انگریزی کے منشا کے خلاف ہے۔ وہ اسے سمجھائیں کہ پنشن پانے کی امید نہ رکھے اور بھٹور چھوڑ کر اپنے وطن دکن واپس چلا جائے۔ لیکن نانا راؤ نے اسے منظور نہ کیا۔

دراصل گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے یہ فیصلہ اپنے لفٹننٹ گورنر طامسن

کی تجویز کے مطابق کیا تھا۔ جو انھیں یہ سمجھاتا رہا تھا کہ اگر نانا راؤ اس علاقے میں رہیگا تو وہ اپنی قوت مضبوط کر کے کسی دن سرکشی پر آمادہ ہوگا۔ اس لئے اسے تنگ کر کے مجبور کیا جائے کہ وہ دکن چلا جائے۔ لیکن اتنی رعایت برتی گئی کہ بٹھور کا علاقہ ضبط نہ کیا اور نانا راؤ ہی کے قبضے میں رکھا لیکن پیشوا کو جو اختیارات حاصل تھے وہ موجودہ جاگیر کو نہ دئے گئے۔

اِنعام کمیشن

اسی طرح بمبئی پریزیڈنسی میں جہاں مرہٹوں کے عہد میں کروڑوں روپے کی جاگیریں تھیں۔ زمینداروں، جاگیرداروں کے حقوق حیلے بہانے سے ضبط کر کے وراثت سے محروم کر دیا گیا۔ یہ بہانہ "انعام کمیشن" تھا۔ جس کے ماتحت یہ طے پایا کہ تمام زمیندار اور جاگیردار حکومت کو اپنی جاگیروں کی باضابطہ سندیں دکھائیں۔ چونکہ تحریری اسناد اور شہادتیں موجود نہ تھیں لہٰذا پانچ برس کے اندر "انعام کمیشن" کے ذریعے پینتیس ۳۵ ہزار جاگیروں کی سندیں طلب کر کے ان میں سے اکثر کو ضبط کر لیا گیا۔

مرہٹوں کے دلوں میں اپنی ذلت و خواری سے انگریزوں کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی مگر مجبور اور بے بس تھے۔

ریاستوں کی ضبطی اور الحاق

اس کے بعد مسلسل جاگیروں اور ریاستوں کی ضبطی اور قبضہ و تصرف

شروع ہوگیا۔ ۱۸۲۶ئہ میں دلّی کے قریب جاٹوں کی ایک ریاست بھرت پور پر انگریزوں کا جبریہ قبضہ ہؤا۔

نیپال جو ہندوستان سے علیحدہ خود مختار ریاست تھی اور عہد نامہ سگولی مارچ ۱۸۱۶ئہ کے مطابق نیپال کے اندرونی انتظامات اور نظام ریاست میں انگریزوں کو کسی قسم کی مداخلت کا اختیار نہ تھا۔ لیکن حکومت نے بدعہدی کی اور سیکڑوں سازشوں اور غداریوں کے جال پھیلا کر نیپال پر تسلّط جمالیا۔ مرہٹوں کی اور ریاستوں میں سے ستارا (پونا) پر قبضہ کیا۔ بہانہ یہ تھا کہ اس کا راجہ لاولد فوت ہؤا ہے۔ اس لئے اسے ضبط کیا جاتا ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اپنے عہد میں متعدد ریاستیں اسی حیلے سے کمپنی کے زیر حکومت کرلیں۔ ستارا کا واقعہ ۱۸۴۹ئہ کا ہے۔ لارڈ ڈلہوزی نے فیصلہ کیا کہ "چونکہ اس ریاست کا حکمران لاولد تھا اس لئے اس کا کوئی جائز وارث نہیں۔ یہ ریاست انگریزی عملداری میں شامل کی جاتی ہے۔ مزید حکومت انگریزی کو اختیار حاصل ہے کہ جس ریاست کے والی کا صلبی لڑکا نہ ہو اس کے متبنیٰ یا کسی حقدار کو وارث نہ سمجھا جائے۔ اور اس کی ریاست کو انگریزی عملداری میں ملا لیا جائے"۔

ریاست ستارا کا راجہ آپا صاحب تھا اور اس نے سیوا جی کے خاندان میں سے ایک لڑکے کو اپنا متبنیٰ بنایا تھا لیکن حکومت نے اسے مرہٹوں کے شاہی خاندان میں ہونے کے باوجود جائز وارث نہ مانا۔ کیونکہ انگریزی حکومت کا اصل مقصد تھا کہ ریاستوں کو اس بہانے سے ضبط کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ایک ایک کرکے ریاست کچھ۔ برما کی تمام ریاستیں۔ میسور اور افغانستان

کے علاقے قبضے میں کرتے رہے۔

افغان کمزور نہ تھے۔ انھوں نے ہر طرح انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ یہاں انگریزی عیاریاں زور پر ہوئیں۔ اور ایسے توڑ جوڑ اور سازشیں کیں کہ افغانوں کی عزیمت و دلاوری کو زیر کر لیا۔ اس سے فارغ ہو کر دوسری ریاستوں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ گوالیار کے بعد سندھ کی طرف بڑھے۔ سندھ کے امیروں نے ہر چند مقابلے کی کوششیں کیں۔ لیکن انگریز ریزیڈنٹ جنرل اوٹرم اور اس کے فوجی کماندار چارلس نیپیر کی سازشوں اور پُر فریب حرکات کے سامنے انھیں بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ آخر سندھ بھی فتح ہو گیا۔

بعدازاں دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے علاوہ ریاست بھاولپور۔ ، ریاست سبھل پور۔ اور ریاست حیدرآباد دکن کو ختم کر کے ۱۸۵۲ء میں ڈونگر پور کے نابالغ مگر جائز وارث راجا کو معزول کر کے ریاست کو ضبط کر لیا۔ اور ۱۸۵۳ء میں جھانسی کی باری آگئی۔ ۱۸۴۲ء میں کمپنی نے گنگا دھر راؤ والئی جھانسی سے نیا معاہدہ کیا تھا۔ جس کی رُو سے راجا کے اختیارات اور فوج میں کمی کر دی تھی۔ راجا نے جب ۱۸۵۳ء میں وفات پائی تو اس کی رانی لکشمی بائی نے کمپنی سے درخواست کی کہ راجا کے متبنیٰ کو تخت نشین کیا جائے۔ مگر کمپنی نے لارڈ ڈلہوزی کے مجریہ اعلان کے مطابق اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا اور جھانسی حکومت انگریزی میں شامل کر لی گئی۔ رانی کو پنشن دی گئی۔ اور قلعے پر انگریزی عملداری ہو گئی۔ رانی کو قلعے کے باہر ایک محل میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ اُس نے ہر چند منّت سماجت کی۔

اپلیں دائر کیں۔ درخواستیں گزاریں۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

سنہ ۱۸۵۳ء ہی میں کرناٹک کا برائے نام نواب لاولد اور پہلے ہی سے انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا فوت ہو گیا۔ چنانچہ کرناٹک اور تنجور پر بھی کمپنی کا قبضہ ہوا۔

اسی سال کئی اور علاقے اور ناگپور وغیرہ لارڈ ڈلہوزی کے حکم سے ضبط ہو کر کمپنی کے تسلط میں آ گئے۔ اب ہندوستان کا بڑا حصہ کمپنی کے زیر حکومت ہو گیا تھا، اور مغلیہ تاجدار بہادر شاہ حکومت کے پنشن خوار بنے لال قلعہ دہلی میں نظر بند کی حیثیت سے تھے۔ رہے سہے دو علاقے اودھ اور پنجاب باقی تھے۔ جن پر کمپنی کا دانت تھا۔

پنجاب کا الحاق

انگریزوں نے سکھوں سے بڑے دوستانہ تعلقات پیدا کئے۔ ان سے بہت سی خفیہ سازشیں کیں اور پنجاب میں ان سے مسلمانوں پر مظالم کرائے۔ سکھوں کی پشت پر ایک طرف انگریزوں کی دوستی کا دکھاوا تھا۔ دوسری طرف ایک مذہبی جنون کا شیدائی گروہ۔ اُس نے پنجاب پر ظالمانہ حکومت کا دور دورہ شروع کیا۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ انگریزوں کی دوست نما دشمنی کا ہاتھ بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کمپنی نے پنجاب کا الحاق کر کے سکھوں کو بے دست و پا کر دیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ جتایا کہ یہ اقدام سکھوں سے مسلمانوں کو مظالم سے محفوظ رکھنے کی غرض سے عمل میں لایا گیا ہے۔

اس طرح کوشش کی گئی کہ یہاں کے مسلمان ان کے ہوا خواہ رہیں۔ لیکن غیور و ذی فہم اس فریب کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ پنجاب پر قبضہ کر کے لارڈ ڈلہوزی نے رنجیت سنگھ سے مغلیہ دربار کا غصب کردہ شہرۂ آفاق و بے بہا ہیرا کوہِ نور، چھین کر ملکہ وکٹوریہ کی نذر کرنے کی غرض سے لندن بھیج دیا۔ اور اس کے بیٹے کو جلاوطن کر دیا۔

پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہونے پر کشمیر کے خود غرض اور عیاش راجہ گلاب سنگھ نے اپنی قوم سے غداری کر کے ریاست کشمیر و جموں کا سارا علاقہ انگریزوں کے حوالے کر کے خط غلامی لکھ دیا۔ سکھ انگریزوں کے قابو میں آنے کے بعد کمپنی کی حکومت کے خیرخواہ و وفادار بن گئے اور انھوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انگریزوں کی دوستی میں باقی قوم اور ملک کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔ ان مسموم تیرہ و تار سیاسی گھٹاؤں کو ملک پر مسلّط کرنے کے بعد ۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چلا دیا۔ اس کا نشانہ اودھ اور سلطانِ اودھ واجد علی شاہ بنے۔

واجد علی شاہ اور اودھ کا الحاق

کمپنی کے حکمرانِ اعلیٰ لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۸۰۱ء میں اودھ کے نواب سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے والئی اودھ کو جو اب تک مغلیہ دور کے عہد میں نواب، وزیر کہلاتے رہے تھے "بادشاہ" کا خطاب دے کر دوستی منظور کی تھی۔ چال یہ تھی کہ انحطاط پذیر و زوال آشنا مغلیہ سلطنت کو والیانِ

اودھ کے مدّمقابل بنایا جائے اور دونوں کے درمیان مخالفت پیدا کرائی جائے تاکہ ان دونوں کے درمیان اتحاد و یگانگی سے انگریزوں کو خوف باقی نہ رہے۔

کمپنی کے اس معاہدے کی رو سے والئی اودھ خود مختار قرار پائے تھے۔ ان کی عملداری اور اندرونی معاملات میں کمپنی کو کبھی مداخلت کا حق نہ تھا۔ لیکن ہر طرف ملک میں آگ لگا کر اور ساری قوتوں کو کمزور یا زیر کرنے کے بعد انگریزوں نے دیکھا کہ اب اودھ پر قبضہ دشوار نہیں۔ اور خود والئی اودھ جن کی فوجی تنظیم ختم کر کے دس سال پہلے انھیں ساز باز کر کے لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مشغول کر دیا تھا۔ اس قدر طاقتور نہیں کہ حفاظت خود اختیاری کے لئے کوئی اقدام کر سکیں۔ فروری ۱۸۵۶ء میں اودھ کو انگریزی عملداری میں شامل کر کے سلطان واجد علی شاہ کو اختیارات سے محروم کر دیا گیا اس الحاق پر سلطان سخت برافروختہ ہوئے۔

ملک بھر میں عموماً اور اودھ و روہیل کھنڈ میں خصوصاً اس پر سخت بے چینی پھیل گئی۔ اب ہر ایک کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ انگریز نے تجارت کے پردے میں اپنی حکومت کا آہنی و سازشی شکنجہ ملک پر جما دیا ہے۔ ملک کے خواص کو مدت سے اس امر کا احساس تھا اور کمپنی کی حکومت کے زیر اثر وہ مدتِ دراز سے ملک کی سیاسی فضا کو مسموم ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مغرب کی خوفناک گھٹا جو رفتہ رفتہ ہند کے اطراف و جوانب پر محیط ہوتی رہی تھی۔ ملک کے سیاسی مفکرین۔ مجاہدین اور علماء و فضلاء اسے بڑھتے ہوئے تشویش ناک انداز

میں دیکھتے رہے تھے۔ انھوں نے مختلف طریقوں سے عوام کو بیدار اور قومی حکمرانوں کی ریاستوں کو اس سے خبردار کرنے کی ہر ممکن جدوجہد کی تھی، لیکن انگریز کی حکمتِ عملی نے ان کی عزیمت اور حکمت و شجاعت کو حیرت انگیز سازش و فریب سے متحد و متفق نہ ہونے دیا تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی جماعتِ مجاہدین نے غیر مسلم عناصر کے خلاف پنجاب اور اس کے مضافات میں جو سرفروشانہ جہاد شروع کیا تھا۔ وہ وطن دشمن غداروں کی ناپاک مساعی نے کچل ڈالا تھا۔ لیکن حقیقت میں جماعتِ مجاہدین کی جدوجہد محض غیر مسلم قوت کے خلاف نہ تھی بلکہ غیر ملکی دشمنوں سے قوم وملک کو آزاد کرانے میں بھی مصروف تھی۔ چنانچہ بالاکوٹ کے مقام پر عارضی شکست اور حضرات ائمہ مجاہدین کی شہادت کے بعد اس جماعت کے معتقدین نے اپنی مساعی کو ہر ممکن طور پر جاری رکھا۔ انھوں نے ملک کے تمام علاقوں میں اپنی خفیہ مجاہدانہ سرگرمیاں مرکوز کر کے سیاسی و جنگی تنظیم کے مرکز قائم کر دیئے تھے۔ اس جماعت کے سرکردہ قائدین میں ملک کے بڑے بڑے علماء و فضلاء شریک تھے۔ ان میں آزمودہ کار دلیر سپاہی بھی تھے۔ جو عام مسلمانوں کو جگہ جگہ منظّم و متّحد کر کے فوجی تربیت دینے میں مشغول تھے۔

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر اضطراب اور بے چینی عام ہوتی جارہی تھی۔ فوجوں میں یہ خیال قوت پکڑ چکا تھا کہ انگریز حاکموں نے جن دیسی سپاہیوں کے بل بوتے پر سارے ملک پر قبضہ کیا ان کے آرام و آسائش کا ان کے دل میں کوئی خیال نہیں۔ بلکہ وہ ان کے ایمان، عزت، اور جان و مال کے دشمن

ہیں۔ وہ اپنا سب کچھ خطرے میں ڈال کر بھی سکھ چین کی زندگی نہیں گزار رہے ہیں اور نہ اپنے اہل وعیال کی پرورش کر سکتے ہیں۔ اس طرح سارے ملک میں اقتصادی بے چینی پھیل چکی تھی۔ دیہات میں کسانوں کاشتکاروں کی جو حالت تھی اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ راجوں مہاراجوں کے اختیارات کی ضبطی اور سب سے زیادہ اودھ کے الحاق اور سلطان واجد علی شاہ کی معزولی نے ممالک متحدہ آگرہ و اودھ اور روہیل کھنڈ کے اضلاع میں دیہات اور شہروں میں بے اطمینانی اور بدامنی کے آثار زیادہ پیدا کر دئے۔ ملک کی اقتصادی بدحالی ہر طرف بڑھ رہی تھی ان اضلاع میں الحاق اودھ کے باعث بے روزگاری نے زور پکڑا دیسی پلٹنیں کئی جگہ توڑی گئیں، سلطان اودھ اور ان کے وزراء کے منوسلین، ملازمین کی کثیر تعداد موقوف ہو کر بیکاری اور افلاس کی مصیبت برداشت کرنے پر مجبور ہوئی۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس الحاق نے لوگوں کے دلوں میں اس بات کا یقین پختہ کر دیا کہ انگریز اس ملک کی بادشاہت حاصل کر کے اہل ہند کو غلام بنانے پر تُل گئے ہیں۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے انگریز حاکموں نے اہل ہند (عوام و خواص) کو اس لالچ اور فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ان کا مقصد کمپنی کی خود مختار حکومت قائم کرنا نہیں۔ بلکہ ملک کے خود مختار حکمرانوں، نوابوں اور راجوں کی حفاظت کرنا اور ان کے اختیارات کی نگہداشت کے ساتھ ہر جگہ امن قائم رکھنا ہے۔ وہ آپس کے فتنہ و فساد اور خانہ جنگی کی مصیبت سے ملک کو محفوظ کر کے بیرونی دشمنوں اور اندرونی خرابیوں کو دور رکھنے کے لئے ملکی انتظامات کو درست کر رہے ہیں۔ جدید اصلاحات نافذ کر کے نئے قانون اور ضابطے بھی

لئے جاری کرتے رہے ہیں کہ وہ ہندوستانیوں کی قومی تنظیم اور اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اور اہل ہند کو جدید تقاضوں کے ماتحت نئی تعلیم اور ترقی سے آشنا کر کے ان کی بہبود اور خوش حالی کے انتظامات کر رہے ہیں۔ لیکن حالات تیزی سے بدلتے گئے اور اہل ملک کے سامنے غیر ملکی فریب کے پردے چاک ہو کر ان کی حکمتِ عملی اور حکمرانی کی سازشیں ظاہر ہونی گئیں۔ اس عرصے میں اہل ہند نے انگریز کی حکومت کی زیادتیوں اور سختیوں کے خلاف کئی بار مختصر پیمانے پر احتجاج بھی کیا۔ کئی جگہ معمولی طور پر فوجی بغاوت بھی ہوئی۔ عوام نے دبے دبے انداز میں ان سختیوں سے نجات پانے کی جدوجہد کی۔ لیکن ہر ممکن طور پر کسی قسم کی بدامنی اور بے چینی کو دبانے اور عوام کے اتفاق واتحاد کو ختم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ فرنگی طاقت اب سر اٹھا چکی تھی اور ہر طرح اپنی زبردستی کا اعلان کرنے پر آمادہ تھی۔

استھانہ کیمپ اور جماعتِ مجاہدین

سنہ ۱۸۵۶ء کے الحاقِ اودھ سے پہلے کئی علاقوں میں معمولی فسادات ہوئے تھے جو انگریزوں کی مخالفت میں تھے۔ عظیم آباد میں کچھ عرصہ پہلے ایک بغاوت دبائی گئی تھی۔ اسی زمانے میں شمالی ہند میں استھانہ[1] کے پہاڑی مقام پر جماعتِ مجاہدین نے باغی کیمپ منظم کر کے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو فرنگی ظلم وجور سے

---

[1] ایک پہاڑی علاقہ میں مجاہدین نے اپنی نو آبادی قائم کر لی تھی۔

نجات دلانے کے لئے جدوجہد کی جائے۔ استھانہ کیمپ کی تنظیم مضبوط ہونے لگی۔ فوج اور پولیس کے سپاہیوں میں بھی مجاہدین کی آواز پہنچ گئی اور اکثر لوگ ان کا ساتھ دینے پر تیار ہوگئے۔ اس کیمپ میں باقاعدہ فوجی تربیت اور نظم ونسق سکھایا جاتا۔ اور بغاوت کی آگ برابر بھڑکتی جارہی تھی،

اس تحریک کے سلسلے میں ایک انگریز افسر ہنٹر نے مجاہدین کی سرگرمیوں کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:۔

"اس جماعت نے ۱۸۵۲ء میں طے کیا کہ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔ روپیہ اور آدمی ہمارے علاقے سے استھانہ کیمپ کو برابر جارہے تھے۔ پنجاب کی مقامی حکومت نے ہماری فوج کی دیسی پیادہ پلٹن نمبر ۴ سے جو اس وقت راولپنڈی میں متعین تھی ساز باز کیا۔ اگر اس کیمپ کے باغی ہمارے علاقے پر چڑھائی کرتے تو ہماری یہی پلٹن اس بغاوت کو دبانے کے لئے بھیجی جاتی۔ لیکن ہم نے یہ فوجی سازش وقت سے پہلے پکڑ لی۔ اور جب یہ بھید ہم پر ظاہر ہوا تو ہم نے پکڑے ہوئے خطوط کے ذریعے سے معلوم کر لیا کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمیوں کی رسد کا باقاعدہ سلسلہ قائم تھا۔ چنانچہ یہ فتنہ برپا ہونے سے پہلے ۱۸۵۲ء ہی میں کچل ڈالا گیا۔ اور ہمارے بہت سے سپاہی باغیوں سے خط وکتابت کرنے اور بغاوت کے جرم میں شریک ہونے پر سزایاب ہوئے"

ہنٹر نے مزید تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ اس باغی کیمپ کے سرگرم مجاہد جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے اور وہ اپنی لگائی ہوئی آگ کے شعلوں کو بھڑکانے کے موقعے تلاش کر رہے تھے۔ وہ کہتا ہے:۔

"غدر سے ذرا پہلے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بناڈالی۔ اور یہاں تک گستاخی اور دلیری پر آمادہ ہو گئے کہ انگریز حاکموں کو ورغلانے اور دھمکانے لگے کہ وہ ان کی تحریک میں شریک ہو کر بغاوت میں ان کا ساتھ دیں۔ اور جب ہمارے افسروں نے ان کی مدد سے انکار کیا تو وہ ہمارے علاقے پر چڑھ دوڑے۔ لفٹنٹ ہورن کے کیمپ پر شب خون مارا۔ جو اس علاقے کا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے جان بچائی انھیں مزہ چکھانے اور اس گستاخی و جرائت کا بدلہ لینے کے لئے ہماری قوت کی مشین فوراً حرکت میں آئی۔ چنانچہ سر سڈنی کاٹن پانچ ہزار فوج (توپخانہ سوار اور پیدل فوج کے ساتھ لیکر باغیوں کے پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہ پہلی جنگ تھی جو اس کیمپ کے خلاف ہمیں لڑنی پڑی۔ ہماری فوج نے باغیوں کے گاؤں جلا کر خاک کر دیے۔ لیکن ان کی مجاہدانہ سرگرمیاں[1] اب بھی ختم نہ ہوئیں اور وہ ادھر اُدھر پھیل کر بغاوت کے شعلے بھڑکانے میں مصروف رہے۔"

مسلمانانِ ہند کی انقلابی سرگرمیاں

اودھ کے الحاق نے روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خان کے خاندان کے

---

[1] جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے خاتمے کے بعد مجاہدین کی یہ جماعت اپنی سرگرمیوں میں برابر مصروف رہی۔ ۱۸۵۷ء کے دوران میں بھی ان کے اکثر مجاہدین نے شرکت کی۔ آخر ۱۸۶۳ء میں انگریزی فوج نے حملہ کر کے پہاڑی قلعے مسمار کئے اور اس کیمپ کا خاتمہ کر دیا۔

خوانین روہیلوں اور جماعتِ مجاہدین کے ارکان، علماء اور سرداروں کو بے حد مشتعل کر دیا تھا۔ ان سب نے متحد و منظم ہونے کی جد و جہد کی۔ اور اپنے علاقوں میں عوام اور دیسی فوجوں میں بیداری اور آزادی کے خیالات پھیلانے لگے۔ بریلی میں خان بہادر خاں جو روہیلہ جماعت کے جری حوصلہ اور صاحب عزم سردار تھے۔ اور جماعتِ مجاہدین کے سرگرم پیرو۔ سب سے پہلے جہاد کی تدبیریں سوچنے میں مصروف ہوئے۔ انہوں نے اپنے گروہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بلا تفریق مذہب و ملّت قومی محاذ پر جمع کرنے کے لئے تیار کیا۔ روہیل کھنڈ میں اپنی جمعیت کی شجاعت کی بدولت اپنا اختیار و تسلّط قائم کیا۔

سیّد احمد اللہ شاہ رح

فیض آباد (اودھ) کے علاقے میں ایک سرگرم مجاہد مولانا احمد اللہ شاہ نے دیسی فوج میں انگریزوں کے خلاف بغاوت پھیلانے کی جد و جہد کی۔ شاہ صاحب دکن کے شاہی خاندان کے فرد تھے اور ان کے بزرگ نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو شہید کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔ شاہ صاحب کے دل میں بچپن ہی سے انگریزوں کے جور و ظلم کے خلاف نفرت تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جماعتِ مجاہدین میں شریک ہوئے۔ مذہبی تعلیم سے آراستہ تھے اور نہایت دلیر سپاہی تھے۔ انہیں اعلیٰ فوجی تربیت دی گئی تھی۔

انہوں نے یورپ کا سفر بھی کیا تھا۔ اور جگہ جگہ گھوم پھر کر نئے زمانے کی سیاست سے واقفیت حاصل کی تھی۔ وطن واپس آکر وہ اس فکر میں تھے

کہ کسی طرح قوم کو انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی پر آمادہ کریں۔

نواب حضرت محل

الحاقِ اودھ کے بعد سلطان واجد علی شاہ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ان کی والدہ ملکہ عالیہ نے سلطان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ لندن جاکر کمپنی کی حکومت کے خلاف ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی جائے۔ سلطان کی ایک بیگم ملکہ حضرت محل مدت سے محل کے اندر رہتے ہوئے قوم و وطن کی حفاظت کے لئے بے چین تھیں۔ انہوں نے انگریزی حکومت کے اثرات کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا۔ کہ ایک دن اودھ پر بھی انگریزی حکومت کا قبضہ ہوگا۔ وہ خفیہ طور پر قومی تنظیم میں مصروف تھیں۔ جب سلطان کے اختیارات ضبط ہوگئے اور حضرت محل کے اندیشوں کے مطابق اودھ پر انگریزی عملداری ہوگئی اس وقت سب سے پہلے حضرت محل نے اندازہ کر کے فیصلہ کیا کہ وہ اب عیش و آرام سے محل میں نہ بیٹھیں گی اور سلطان کے ساتھ جائیں گی۔ سلطان نے بہت اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ برما کے راستے لندن چلیں۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے سلطان کی عزت اور شان اور قوم و ملک کا امن و سکون اپنی جان اور آرام سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اپنے وطن میں رہ کر قوم کی خدمت کروں گی۔ سلطان اور ملکہ عالیہ برما کو روانہ ہوئے لیکن علیل ہوگئے۔ اور راستے ہی سے کلکتہ چلنے لگے۔ ملکۂ عالیہ لندن گئیں اور عرصے تک وہاں مقیم رہیں۔ لیکن ملکہ وکٹوریہ کے سامنے پیش ہونے کا موقع نہ ملا۔

آخر واپس آ گئیں۔ سلطان عالم نے کلکتہ پہنچکر مٹیا برج میں سکونت اختیار کر لی۔

انگریزوں نے سلطان کے لئے کلکتہ کے مٹیا برج کو لکھنؤ کا قیصر باغ بنا کر عیش و آرام کے تمام سامان مہیا کر دیئے تاکہ وہ غافل ہو کر ان کی ملک گیری میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ لیکن ملک بھر میں بیداری کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ ایک طرف جماعتِ مجاہدین کے سربر آوردہ ارکان جگہ جگہ مسلمانوں میں قومیت و وطنیت کے جذبات ابھار کر غیر ملکی تسلط سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے آمادہ کر رہے تھے۔ اور دیسی فوجوں میں خفیہ طور پر انقلاب کی چنگاریاں لگانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ راجے، نواب اور جاگیر دار تھے۔ جو کسی نہ کسی طرح اپنے علاقوں اور اختیارات سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ وہ اپنی ضبط شدہ قوت اور دولت کی واپسی کے لئے ہر طرح کے منصوبے بنا رہے تھے۔

ان میں سے اکثر نے کمپنی کے اعلیٰ حاکموں کے سامنے اپیلیں دائر کیں۔ مگر ناکام رہے۔ آخر وہ بھی انقلابی گروہ کے ساتھ شریک ہونے پر آمادہ نظر آنے لگے۔ ان میں سے پیش پیش یہ اشخاص تھے۔ نانا راؤ۔ رانی جھانسی اور حضرت محل۔

دو کے جانبازانِ وطن

رانی جھانسی جس کا خاص مقصد وسن پرستی نہ تھا شروع سے آخر تک مدتوں کمپنی کو درخواستیں دیتی اور مقامی حکام انگریزی کی منت سماجت کرتی رہی کہ اس کے متبنیٰ کا والئی ریاست ہونا منظور کر لیا جائے تو

وہ انگریزوں سے وفادار رہے گی۔ اسی طرح نانا راؤ نے بھی اپنے ضبط شدہ اختیارات کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ لیکن حکومت نے کسی کی نہ سُنی۔ حضرت محل نے خالص قومی جذبات کے ماتحت انقلابی نعرہ بلند کیا۔ اور آخر تک ثابت قدم رہی۔

عوام میں بے چینی اور بد دلی عام تھی۔ اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے انہیں کمپنی کے راج میں اپنے دین دھرم، عزت اور جان و مال سب خطرے میں نظر آرہے تھے۔ تنظیم کا خفیہ کام مدت سے جاری تھا۔ مجاہدین اور ہر فرقے کے لیڈر غلامی کے بڑھتے ہوئے طوفان سے اہلِ ہند کو آگاہ کر کے انقلاب کے لئے تیار کر رہے تھے۔

متذکرہ بالا اسباب کی بنا پر فوجوں میں بھی کمپنی کی حکومت کے خلاف بیزاری پھیل چکی تھی۔ آہستہ آہستہ ہندو اور مسلمان سب متحد ہو کر ایک محاذ پر جمع ہونے کے موقعے تلاش کر رہے تھے۔

تنظیم و اتحاد

۱۸۵۶ء میں متواتر کئی اہم باتیں ایسی ہوئیں جن سے ثابت ہو گیا کہ کمپنی کی حکومت اب عنقریب اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر کے ہندوستان کا دین و ایمان، آزادی اور ملک و مال چھین کر غلام بنانے کا فیصلہ کرنے والی ہے۔ چنانچہ تمام جماعتوں کے سربرآوردہ اصحاب نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔

انقلاب کی چنگاریاں

انقلابی جماعت کی سیاسی سرگرمیاں سارے ملک میں پھیل رہی تھیں۔ عظیم اللہ خان نے حکومتِ ترکی کو متعدد خطوط لکھے جو لارڈ رابرٹس کے بیان کے مطابق قسطنطنیہ کے عمر پاشا کے نام تھے۔ اور ان میں سپاہیوں کی بے چینی اور ہندوستان کی عام سیاسی ابتری کا حال بیان کیا گیا تھا۔

نانا راؤ نے ۱۸۵۵ء کے اواخر میں اپنے قاصد اور خفیہ جاسوس ہندوستان کے مختلف اضلاع میں بھیجکر عوام کو منظم کرنے کی جد و جہد جاری کر دی تھی۔ ایک سپاہی کالی ندی کی لڑائی کے موقع پر زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ اور زخمی حالت میں جب ایک گورے سپاہی نے اس سے پوچھا کہ — "تم نے حکومت سے بغاوت کی کیوں کر جرأت کی۔" تو اُس نے فوراً بے دھڑک جواب دیا کہ "اگر ہندوستان کے سب ہمارے سپاہی اکٹھے ہو کر تم سے لڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو تمام گورے ہماری قوم کے اتحادی سمندر میں قطرے کی حیثیت رکھیں گے۔"

اسی دوران میں ایک سپاہی جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا۔ اس کے قبضے سے ایک خط نکلا جس کی عبارت یہ تھی:۔

"بھائیو! ہم خود اجنبی چھرا اپنے جسموں میں بھونکے بیٹھے ہیں۔ اگر ہم ہمت کر کے اُٹھ کھڑے ہوں تو کلکتہ سے پشاور تک ہمارے قبضے میں ہوگا۔"

انگریز حکام نے کچھ خطوط پکڑے جن کے متعلق سرکاری دستاویزات میں درج ہے کہ:۔

"ان خطوط سے ثابت ہوتا تھا کہ بنگال سے باغیوں کے کیمپ کو آدمی اور اسلحہ بھیجنے کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہے۔ اسی زمانہ ۱۹ اگست ۱۸۵۲ء کو پٹنہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ باغی جماعت اور باغیانہ خیالات ترقی پر ہیں۔ انگریزی صوبے کے اسی دارالسلطنت (پٹنہ) کے خاص باشندے علانیہ بغاوت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ پولیس بھی ان سے ملی ہوئی ہے۔ اور ان کے ایک سردار (مولوی احمداللہ) نے اپنے مکان میں سات سو آدمیوں کے ایک جلسے میں اعلان کیا کہ اگر مجسٹریٹ کی طرف سے مزید خانہ تلاشی ہوئی تو وہ ہتھیاروں سے مقابلہ کریں گے، حکومت برطانیہ اب زیادہ دنوں تک اپنے علاقے میں ایک باغیانہ ادارے کی طرف سے چشم پوشی نہ کر سکتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے اہم کارروائیاں کیں۔ اسی سال ہمارے حلیف امب کے رئیس پر باغیوں نے حملہ کیا۔ اور ہمیں اس کی امداد کے لئے انگریزی فوج بھیجنا پڑی۔ (اور کچھ عرصہ بعد) ہمارے متعدد دیسی سپاہیوں کو باغیوں سے خفیہ خط وکتابت اور سازش کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔"

مولانا سید احمداللہ شاہ نے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے علاوہ پنجاب، شمالی سرحد۔ متوسط ہند وغیرہ کے تمام علاقوں کے دورے کئے۔ وہ جہاں جاتے تقریر سے آگ لگا دیتے۔ ہندوستانی فوجوں کے دیسی افسروں کو مخاطب کرکے انھوں نے انقلابی منصوبوں سے آگاہ کیا۔ سپاہیوں کی بیزاری اور بے چینی کا علاج بتایا۔

حضرت محل کے انقلابی پروگرام کی روح رواں بن کر انھوں نے روہیل کھنڈ

اور اودھ کو اپنا ہمنوا بنا لیا - فیض آباد کی فوجی چھاؤنی میں بغاوت کے آثار دیکھ کر انگریز افسروں نے احمد اللہ شاہ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا - ان پر مقدمہ چلایا گیا - اور سزایاب ہو کر جیل بھیج دئے گئے -

چپاتیاں اور کنول

اس دوران میں احمد اللہ شاہ نے جگہ جگہ فوجی چھاؤنیوں اور دیہات میں دورے کر کے گیہوں کی چپاتیاں اور بکری کے گوشت کی بوٹیاں تقسیم کرانے کی مہم جاری کی جو دوسرے لیڈروں کے ذریعے ہر طرف پھیل گئی -

ہندوؤں نے گیہوں کی چپاتیاں اور سرخ کنول کے پھول تقسیم کیئے - اس تقسیم کا سلسلہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک گیر ہو گیا - اُتر سے دکن تک اور پورب سے پچھم تک کوئی شہر اور گاؤں ایسا نہ تھا جہاں یہ چپاتیاں عوام میں تقسیم نہ کی گئی ہوں - انگریز حکام اور بعض "وفادار" دیسی افسروں نے اپنے اپنے ضلعوں میں اس تقسیم کو روکنے اور تحقیقات کرنے کی ہر ممکن کوشش کی - لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی اور نہ یہ پتا چلا سکے کہ اس تقسیم کا مقصد کیا ہے اور کس طرح تقسیم کی جاتی ہیں -

بعض انگریز حاکموں نے اپنے اعلیٰ افسروں کو اپنی رپورٹ میں یہ کہکر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہندوؤں نے وبائی امراض کو روکنے کی غرض سے خیرات یا صدقے کے طور پر یہ چپاتیاں بانٹی ہیں - لیکن حقیقت اس کے خلاف تھی - کیونکہ وبائی امراض محض چند علاقوں میں پھیلے تھے - مگر چپاتیوں

کی تقسیم سے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ یہ تقسیم انقلابی تحریک کی منظم کارروائی تھی جو غالباً اس نشان یا علامت کے طور پر جاری کی گئی تھی کہ ملک کے ہندو اور مسلمان جن سے غیر ملکی قوت ان کی روٹی چھین کر ان کے وطن پر قابض ہو کر انہیں غلام بنانا چاہتی ہے۔ ایک خیال اور ایک دل ہو کر متحد ومتفق ہو جائیں۔ اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ اس انقلابی تحریک کے منظم ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس دوران میں ہندو اور مسلمان لیڈر جگہ جگہ فقیروں اور سادھوؤں کا بھیس بدل کر فوجوں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔ جس کی صداقت میں متعدد انگریز افسروں کے بیانات موجود ہیں۔ اور کئی جگہ انقلابی جماعت کے مجاہدین کو گرفتار بھی کیا گیا تھا۔

بغاوت کے آثار

۱۸۵۶ء میں یہ انقلابی سرگرمیاں ہر طرف ترقی پر نظر آنے لگیں، ملک کے سیاسی رہنماؤں نے عوام کی فوجی تربیت کی طرف بھی خاص توجہ کی اور فوجوں میں بیداری پھیلانے کا بھی اہم کام انجام دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غیر ملکی سنگین طاقت کا قلعہ فتح کرنے اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے صرف زبانی باتوں سے کام نہ چلے گا۔ بلکہ مسلح فوجوں کی امداد ضروری ہو گی۔ اس لئے تحریک جہاد میں فوجوں کی شرکت کی منظم جدوجہد جاری تھی۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے علاوہ دوسرے رہنماؤں نے بھی اپنی اپنی جگہ فوجوں کو اس تحریک میں شریک کرنے کی سعی کی — بریلی میں خان بہادر خان کی رہنمائی میں کثیر فوجی جماعت انگریزوں کے خلاف اعلان بغاوت کرنے پر تلی ہوئی تھی بجیب آباد

میں نواب محمود خان کے زیر قیادت ضلع بجنور اور مراد آباد کے تمام علاقے انقلابی تحریک میں شریک تھے۔ مولوی عظیم اللہ خان کانپور میں اپنے شاگرد نانا راؤ کے ساتھ تنظیم میں مصروف تھے۔ عظیم اللہ خان، جو ابتداءً ایک سکول میں مدرس تھے، رفتہ رفتہ جدید علوم و فنون کی مہارت حاصل کر کے یورپ اور روس وغیرہ کے دورے پر گئے۔ اور تمام ممالک میں سیاسی رہنماؤں سے گفت و شنید کر کے انھوں نے ہندوستان کی آزادی کا انقلابی لائحہ عمل تیار کیا —— لندن میں نانا راؤ کی جاگیر اور اختیارات کی بحالی کی بھی کوشش کی جو ناکام رہی۔ آخر انھوں نے وطن واپس آکر قومی تنظیم شروع کی۔ نانا راؤ اور اس علاقے کے مسلم و غیر مسلم رہنماؤں سے مل کر عوام و خواص کو انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف اکسانے اور جہادِ آزادی کے لئے تیار کرنے میں سرگرم عمل ہوئے۔ وہ بڑے صاحب علم و عمل اور دلیر شخص تھے جن کی تربیت نے نانا راؤ کو بھی ایک عظیم رہنما بنا دیا۔ نانا راؤ خود بھی بہت بہادر اور مستقل مزاج سپاہی تھا۔ لیکن زیادہ پختہ کار مدبر نہ تھا۔ اُس نے عظیم اللہ خان کے مشوروں اور مولوی سلامت اللہ۔ علی شاہ کوتوال قاضی عین الدین۔ قاضی وسیع الدین وغیرہ رہنماؤں کی سرکردگی میں اپنے علاقے کی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس کے ساتھ تانتیا ٹوپی بھی انقلابی جماعت میں پیش پیش تھا۔ یہ شخص بیحد حوصلہ مند اور جری سپہ سالار تھا۔ اور اس کے دل میں صرف قوم و وطن کی آزادی کا جذبہ موجیں مار رہا تھا۔ دوسرے سرداروں اور راجوں کی طرح اس کی کوئی ذاتی غرض بھی وابستہ نہ تھی۔

نہ اس کے سامنے اپنی کسی جاگیر کی بحالی کا جھگڑا تھا اور نہ وہ اختیارات حاصل کر کے انگریزوں سے صلح کا طلبگار تھا۔ وہ صرف وطن کو غلامی کے عذاب سے چھڑانے کے لئے بیتاب تھا۔

الٰہ آباد میں مولوی لیاقت علی جو صاحبِ علم وفضل بھی تھے اور تجربہ کار، جنگجو سپہ سالار بھی، برابر فوجی تنظیم اور انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے اس علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کثیر تعداد کو انقلابی جماعت میں شریک کر لیا تھا۔ دہلی کے گردو نواح میں شہزادہ[1] فیروز شاہ خاندان مغلیہ کا چشم وچراغ صاحبِ عزم وہمت نوجوان تھا۔ وہ جہادِ آزادی کی تحریک میں پیش پیش خفیہ طور پر انقلابی جماعت کے منظم پروگرام کے ماتحت تن من دھن سے لگا ہوا تھا۔ غرض ان تمام علاقوں میں ملکی رہنما تحریکِ آزادی کی تنظیم میں مصروف اس فکر میں تھے کہ چاروں طرف سے متحد ہو کر مناسب موقع پر غیر ملکی تسلط کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔

چربی کے کارتوس

جنگِ کریمیا کے موقع پر ۱۸۵۳ء میں برطانوی فوج نے ایک قسم کی نئی رائفلیں استعمال کی تھیں۔ اور اس تجربے کے بعد حکومت ان رائفلوں کو ہندوستانی فوجوں میں بھی رائج کرنا چاہتی تھی۔ اس رائفل میں ایک نیا کارتوس استعمال

---

[1] فیروز شاہ ناظم بخت کے بیٹے اور فرخ سیر بادشاہ کے نواسے تھے۔

ہوتا تھا جس کے کناروں پر چربی لگی ہوئی تھی جسے منہ سے توڑ کر رائفل میں رکھنا پڑتا تھا - ان کارتوسوں کے استعمال کی غرض سے رائفل بھرنے اور چلانے کی تربیت کے لئے چند دیسی افسروں کو فوجی مرکزوں پر جانا پڑا -

ان کارتوسوں کے بارے میں بعض ہندو سپاہیوں کو یہ معلوم ہوا کہ ان میں جو چربی لگائی گئی ہے یہ گائے کی ہے - اور یہ بات ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیلتی سب چھاؤنیوں میں مشہور ہو گئی - اس کے ساتھ مسلمان سپاہیوں کو اندیشہ ہوا کہ یہ چربی سؤر کی ہے - چنانچہ اس شبہ نے سب کے دلوں میں گھر کر لیا - سپاہی ہر جگہ اپنے اپنے دین دھرم کو خطرے میں سمجھ رہے تھے - اور مدت سے خیال تھا کہ انگریزی حکومت انہیں بے دین کرنا چاہتی ہے -

ان کارتوسوں کے استعمال پر سب سے پہلے بارک پور (بنگال) کی چھاؤنی میں ہندو سپاہیوں نے مخالفت کی - جب انگریز افسروں نے انہیں سختی سے یہ کارتوس استعمال کرنے کا حکم دیا - تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے - اور اس پر خاصا فساد ہوا - سپاہیوں کو سزائیں ملیں - لیکن اس بات نے دُور دور فوجوں میں بے چینی اور ناراضی پھیلا دی - ہندو اور مسلمان دونوں ان کارتوسوں کے استعمال کو اپنے اپنے مذہب کے خلاف سمجھ کر اس جبر و سختی کو براہ راست دینی مداخلت جاننے لگے -

اسی زمانے میں انقلابی تحریک کا سلسلہ جاری تھا - فوجوں اور دیہات میں اتحاد و تنظیم کی غرض سے چپاتیاں تقسیم ہو رہی تھیں - ادھر فوجوں میں نئے

کارتوسوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔

لکھنؤ میں آزادی کے شعلے

اودھ اور روہیل کھنڈ میں انقلابی جماعت کی سرگرمیاں سب سے زیادہ تھیں حضرت محل لکھنؤ میں جوش و خروش سے جنگِ آزادی کے آغاز کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ سلطنت کے ایک معتمد ممو خان ان کے مشیر خاص کی حیثیت میں نہایت عزم و صداقت سے کام کر رہے تھے۔

انھوں نے ایک مجاہد کمبل پوش کی رعایت سے ایک فوجی چھاؤنی میں آگ لگوا دی۔ کمبل پوش کو گرفتار کر کے ان کے چند رفقا کے ساتھ لکھنؤ میں پھانسی دیگئی۔ شعلے بھڑک چکے تھے۔ حضرت محل نے اس عرصے میں اپنے مجاہدین کی جماعت کی تنظیم مستحکم کر لی۔ اور قریب کے علاقوں کے جاگیرداروں سے مراسلت کر کے انھیں اپنی شرکت کے لئے آمادہ کرتی رہیں۔

منگل پانڈے

اسی دوران میں بیرام پور اور بارک پور کی رجمنٹوں میں کارتوسوں کے استعمال کے خلاف ناراضی ظاہر کرتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ شدید فساد ہوا۔ کئی انگریز افسروں پر حملے کئے گئے ایک سورما منگل پانڈے اس شورش کا سرغنہ تھا اور ایشوری پانڈے اس کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ ان دونوں کو گرفتار کر کے کورٹ مارشل کے ذریعے سے سزائے موت دی گئی۔

گرفتاری سے پہلے منگل پانڈے نے انگریز افسر پر گولی چلائی مگر وہ بچ گیا۔ اس کے بعد منگل پانڈے نے گولی چلا کر خود کو ہلاک کرنے کی کوشش کی اور سخت زخمی ہؤا۔ اس نے پھانسی پر لٹکتے ہوئے نہایت دلیری سے اپنے ہم وطن فوجی بھائیوں کو مخاطب کر کے کہا :- "ہماری موت سے عبرت حاصل کرو۔ ہم وطن کی عزت اور دھرم کی خاطر قربان ہوتے ہیں۔ تم اس سے سبق حاصل کرو اور دین دھرم اور وطن کی لاج رکھو۔"

منگل پانڈے پہلا سپاہی تھا جس نے تنہا حکومت کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا اور تنہا انگریزوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ دیسی سپاہیوں میں اس کی سزایابی سے بہت اضطراب پھیل گیا۔

فوجوں میں شورش

اب جگہ جگہ شورش اور مختصر پیمانے پر بلوے، فساد برپا ہو رہے تھے۔ جنھیں انگریزی اور ہندوستانی فوجوں کے بل پر سختی سے کچلا جا رہا تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کی اس شورش کو دبانا اور ان پر زور و سختی سے حکمرانی کرنا بہت آسان ہے۔

۱۸۵۷ء کے آغاز سے اپریل تک اضطراب اور بدامنی کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ عرصہ ہؤا ۱۸۵۶ء کے آخر میں لارڈ ڈلہوزی اپنے جانشین لارڈ کیننگ کو گورنر جنرل کے عہدے کا چارج دے کر انگلستان رخصت ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے زمانے کا بویا ہؤا بدامنی کا بیج کیننگ کے سامنے جڑیں پکڑتا جا رہا تھا۔ آخر اس کے پھل

بھی کیننگ ہی کو توڑنا پڑے ۔

ایران اور روس کے انقلابی اشتہارات

اس زمانہ میں دہلی کے بازاروں اور شہر کے مختلف گلی، کوچوں میں کچھ اشتہارات چسپاں نظر آتے تھے جن میں روس اور ایران کی جانب سے ہندوستان پر حملے کا ذکر کیا گیا۔ خصوصاً کئی اشتہارات میں شہزادۂ ایران کی جانب سے شہنشاہِ دہلی اور اہلِ ہند کو متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ فرنگی کافروں کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے عنقریب ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ دہلی کے کئی اخباروں خصوصاً "صادق الاخبار" میں ان اشتہارات کو شائع کیا گیا اور حکومت کی وفاداری میں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان باتوں کو مزخرفات بتایا گیا۔

۱۳؍ اپریل ۱۸۵۷ء کے اخبار "خلاصۃ الاخبار" دہلی میں حسب ذیل بیان شائع ہوا :-

"چند روز ہوئے کہ جامع مسجد کی دیوار پر ایک اعلان چسپاں کیا گیا تھا۔ اس پر ایک تلوار اور ڈھال کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اور یہ اعلان شاہِ ایران کے پاس سے آیا ہوا بتلاتے تھے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا۔ "تمام سچے مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ کمر بستہ ہو کر شاہِ ایران کی اعانت کریں اور وفاداری سے اس کی حکومت و اختیار کو ملحوظ رکھیں۔ اور انگریزوں سے جہاد کریں۔ تاکہ انھیں تباہ و برباد کر کے اس کی عنایت کے مورد ہوں۔ انعامات و خطابات حاصل کریں۔ جو شاہ ایران فراخ دلی سے عطا کرے گا۔" پھر

اعلان میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ شاہِ ایران یا جمشید ثانی بہت جلد ہندوستان آئے گا اور اس ملک کو خود مختار بنا دے گا۔ اور ایران میں عوام الناس جمع ہو کر حسب ذیل فقرے پر بار بار تکرار کرتے ہیں:-

"خدایا خاک ایران کو بدبختوں کی ہوا سے بچائیو جب تک
خاک اور ہوا زندہ رہیں"

اس اخبار نے اس اشتہار کو مہمل بنایا اور محض دل لگی میں اڑایا۔

ان اشتہارات کی اصلیت کچھ بھی ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انقلابی جماعت کے رہنما دہلی اور اس کے مضافات میں انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے دے کر مسلمانوں کو جنگِ آزادی کے لئے آمادہ کر رہے تھے۔ ان اشتہارات اور انقلاب کی افواہوں نے بلاتفریق مذہب وملت تمام عوام کو بیدار و ہوشیار کر دیا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں ریلیں، ڈاک کے نئے انتظامات اور تار برقی وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مگر ابھی عام نہ ہوا تھا۔ فوجوں کی بغاوت اور فتنہ و فساد کی خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ دیر میں پہنچ سکتی تھیں۔ ان میں سے بہت سی خبروں کو انگریز حکام نے دبانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس لئے فسادات کی اطلاعیں عام نہ ہونے پائی تھیں ورنہ ممکن تھا بغاوت کی آگ اک دم پھیل جاتی۔

انگریز افسروں کی بے حسی اور غفلت

اودھ کے الحاق کے بعد ہی کئی فوجی چھاؤنیوں میں مختلف شکایات پر فساد ہوئے۔ اعلیٰ فوجی حکام ان حالات سے کسی قدر فکر مند تھے۔ بعض نے اصلاح کی کوشش بھی

کی ۔ مگر زیادہ تر غافل رہے ۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں کمانڈر انچیف شملہ جاتے ہوئے انبالہ سے گذرا ۔ اور دیسی افواج کو مخاطب کر کے اُس نے چربی کے کارتوسوں کے بارے میں غلط فہمی دُور کرنے کی تاکید کرتے ہوئے انھیں حکومت سے وفادار رہنے کی ہدایت کی ۔ انبالہ چھاؤنی ایک بڑی فوجی تربیت گاہ تھی جہاں نئی رائفل کے استعمال کی تربیت دی جاتی تھی ۔ مختلف رجمنٹوں کے دیسی افسر وہاں آکر ان کا استعمال سیکھتے اور واپس جاکر اپنی فوجوں کے سپاہیوں کو سکھاتے ۔ تربیت پانے والوں میں حوالدار کاشی رام تیواڑی اور نائک جیوالال دوبے بھی تھا ۔ جو چھتیسویں انفنٹری کا دیسی افسر اور کمانڈر انچیف کے اردلی دستے میں شامل تھا ۔ جب ان دونوں کو یہ کارتوس دئے گئے اور ان کے استعمال کا طریقہ سکھایا گیا تو انھوں نے بجربہ اسے قبول کیا لیکن انہیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ وہ علیسائی بنائے جا رہے ہیں ۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے انسٹرکٹر لفٹنٹ مارٹین کے پاس گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے اپنی مجبوری اور بے بسی کا حال بتایا کہ وہ اب کہیں کے نہ رہے ۔ وہ اپنے گاؤں واپس جائیں گے تو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوں گے ۔ ان کا کیا حشر ہوگا ۔ انسٹرکٹر مارٹین انھیں کمانڈر انچیف اور جنرل "این سن" کے پاس لے گیا اور ان دونوں نے انہیں یقین دلایا کہ کارتوسوں کے بارے میں تمام افواہیں غلط ہیں ۔ انھیں کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیئے ۔ ان دونوں نے کہا "ہمیں اپنے اعلیٰ افسروں کے بیان پر پورا بھروسا ہے ۔ اور ہم سرکار کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی جائز نہیں سمجھتے ۔ ہم ہر طرح وفادار رہنے کا عہد بھی کرتے ہیں ۔ لیکن ہمارے یقین سے کیا ہوتا ہے جب ایک آدمی کے بیان

کے مقابلے میں ملک کے دس ہزار آدمی اس افواہ کو پھیلانے اور سارے ملک کو یقین دلا رہے ہیں۔ ہم اپنی فوج کے سپاہیوں کو مطمئن کر دیں تو اپنے گاؤں کو کس طرح یقین دلا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح تمام سپاہیوں کو اپنے اپنے گاؤں، خاندانوں اور گھر والوں کو اطمینان دلانا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ہمیں اس یقین کا خمیازہ بُری طرح بھگتنا پڑے گا ہم اچھوت بنا دئے جائیں گے۔ اور ہمیں ہمیشہ کے لیئے اپنے گھر، کنبے اور وطن (گاؤں) کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ اور اس طرح فوجی فرمانبرداری و اطاعت کے بدلے ناقابل برداشت سماجی سزا بھگتنا پڑیگی اور یہ زندگی ہمارے حق میں لعنت و عذاب بن جائے گی۔"

لفٹنٹ مارٹین نے ان کے بیانات کی تصدیق کرتے ہوئے ان کے خدشات وشبہات کو حق بجانب بتایا ہے۔ اُس نے کہا :۔

"اُن لوگوں نے اپنی مشکلات کو نہایت مودبانہ و عاجزانہ انداز میں افسروں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور ضروری تھا کہ اس امر کی مناسب تحقیقات کرکے اطمینان بخش کارروائی کی جاتی۔"

لیکن ان کی کوئی شنوائی نہ کی گئی۔ ۱۶، اپریل ۱۸۵۷ء کو ایک رجمنٹ کے صوبیدار درگپال سنگھ کی اسی قسم کی شکایت پر رجمنٹ کے انگریز افسر نے اس کے فعل کو "سخت ناروا اور غیر سپاہیانہ" ظاہر کر کے اس کے خلاف تشدد آمیز کارروائی کی۔ اس پر کاشی رام اور جیوا لال سخت برہم ہوئے۔ انھوں نے اپنی چھاؤنی میں واپس جاکر تمام سپاہیوں سے اپنی شکایت افسروں کی غفلت اور درگپال سنگھ سے نازیبا سلوک کا ذکر کرکے ان کے درمیان بے چینی

کی لہر دوڑا دی۔ تمام سپاہی غم و غصہ سے مضطرب تھے، اور آنے والے خطرات سے چوکنا ہونے کی فکر میں بیتاب۔

کارتوس کا خطرہ

ایک انگریز افسر جے کیو براؤن اپنی یادداشت "۱۸۵۷ء میں پنجاب و دہلی" میں لکھتا ہے کہ:-

"حوالدار کاشی رام کی شکایت کے جواب میں اس کی آئندہ ترقی بند کر دی گئی۔ نیز انگریز افسروں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا کہ ان کی شکایتوں کی شنوائی نہ کی ہو یا معمولی بدسلوکی کر کے درگزر کر دی ہو بلکہ وہ اس حد تک آمادہ ہو گئے کہ تمام سپاہیوں کو پریڈ پر طلب کر کے انھیں کارتوسوں کے استعمال پر مجبور کیا گیا۔ اور جتایا گیا کہ یہ ان کے خوف اور تعصب کی سزا ہے مجبور سپاہیوں نے نافرمانی نہ کی لیکن انھوں نے کہا کہ خود ان کے دل میں کارتوسوں کے استعمال سے کوئی شبہ نہیں اور نہ وہ حکم ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے کنبے اور گاؤں کے لوگوں کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔ وہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں سماج اور برادری سے خارج کر دینے پر آمادہ ہیں۔ انگریز افسروں نے سختی سے حکم دیا کہ اس صورت میں وہ مذہب اور روزی، دونوں میں سے ایک کو چن لیں۔ اگر بغیر چون وچرا کارتوس استعمال کرنے پر رضامند ہیں تو ملازم رہ سکتے ہیں ورنہ انھیں فوراً موقوف کر دیا جائے گا۔ اس جبر و تشدد کے بعد ان سپاہیوں نے جو طرزِ عمل

اختیار کیا اس کے لئے انھیں مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس فعل کے لئے مجبور کر دئے گئے تھے۔"

کارتوسوں کو منہ سے توڑنے کے خلاف سپاہیوں کی ناراضی بڑھتی گئی۔ اور انگریز افسروں کی تنبیہ اور تشدد بھی ترقی پر رہا۔ کہیں کہیں بعض افسروں نے اس پر کچھ غور بھی کیا اور سپاہیوں کی شکایت رفع کرنے کے لیے یہ طریقہ میں تبدیلی کر دینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔

میرٹھ چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر لفٹنٹ کرنل ہوگ نے فیصلہ کیا کہ کارتوس کا ایک کنارہ ہاتھ سے توڑ کر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اسے منہ سے توڑنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور اس تجویز پر چند دوسرے تجربہ کار افسروں نے رضامندی ظاہر کی، لیکن گورنر جنرل کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہو چکا تھا اور عملی فیصلے کے لئے ان کے حکم کا انتظار تھا۔ لارڈ کیننگ نے کمانڈر انچیف کی رائے دریافت کی تھی۔ اور اس فیصلہ کن مشورے پر اس مسئلے کے طے ہونے کا انحصار تھا، اور ۵ مارچ ۱۸۵۷ء کو کمانڈر انچیف کی رائے کے مطابق یہ طے بھی پا گیا تھا کہ کارتوس منہ سے توڑنے کے لئے سپاہیوں کو مجبور نہ کیا جائے۔ مگر حیرت ہے کہ حکومت کے یہ احکام دبا لئے گئے اور ان کے نفاذ سے احتراز کر کے سپاہیوں کو ہر طرح مروجہ طریقے کے لئے سختی سے مجبور کیا جاتا رہا۔

لکھنؤ کا انقلاب

مئی ۱۸۵۷ء کے آغاز کے ساتھ حضرت محل کی قیادت میں نعرۂ انقلاب

بلند ہوا سب سے پہلے مجاہدین نے جیل خانہ توڑ کر سید احمد اللہ شاہ کو آزاد کرالیا۔ جنھوں نے باقاعدہ جہاد کا اعلان کر کے جنگ آزادی کا آغاز کر دیا۔ ریزیڈنسی پر حملہ ہوا۔ انگریز فوج پسپا ہونے لگی۔ مجاہدین نے انگریزوں کو ہر موقع پر زک دینا شروع کر دی۔ حکومت سراسیمہ ہو گئی۔ نانا راؤ نے لکھنؤ کا رخ کیا۔

کانپور سے انگریز پلٹن بلائی گئی۔ مگر راستے بند کر دیئے گئے۔ اور یہ سب کچھ مولوی احمد اللہ شاہ اور حضرت محل کی مجاہدانہ عزیمت کی بدولت ہوا۔ کچھ عرصہ بعد عوام و خواص کی رائے سے حضرت محل کے بیٹے نواب برجیس قدر کو (جو اس وقت دس برس کے تھے) اودھ کے تخت پر بٹھا کر ان کی بادشاہی کا جلوس منعقد کیا گیا۔ اور بہادر شاہ کو شہنشاہ ہند تسلیم کرتے ہوئے ان کی وفاداری کا اعلان کیا گیا۔ نیز برجیس قدر کی تخت نشینی کے لئے دربارِ مغلیہ سے منظوری طلب کی گئی۔ بہادر شاہ نے اپنی منظوری اور مبارک باد کے ساتھ شاہی خلعت تحفے میں بھیجا۔

ان دنوں ملک کے تمام علاقوں سے جن سرداروں اور رہنماؤں نے اپنی جمعیتیں اکٹھی کر کے کمپنی کی حکومت کے خلاف جنگِ آزادی کا تہیہ کیا تھا ان سب نے بالاتفاق تاجدار مغلیہ شاہ دہلی کو اپنا شہنشاہ ماننے کا اعلان کیا۔ اور سلطنتِ مغلیہ کی بحالی کے منصوبے تیار کئے جا رہے تھے۔ اس لئے عوامی ہند کا ایک ہی مرکز تھا۔ اور سب کی جدوجہد اس کے چاروں طرف متحد ہو کر غیر ملکی حکومت کے خلاف جمہوری انقلاب برپا کرنے میں مصروف تھی۔ جس میں اسلامیان ہند کے عزائم اور قیادت پیش پیش تھی۔

حضرت محل کی سرکردگی میں ابھی تک زیادہ تر باقاعدہ فوجوں میں شورش پیدا نہ ہوئی تھی بلکہ سابقہ شاہی افواج کے برخاست شدہ سپاہی اور دوسرے عوام ان کی جماعت میں شریک تھے۔ غالبًا اس عرصے میں انبالہ اور دوسری فوجی چھاؤنیوں وغیرہ کے فسادات کی خبریں لکھنؤ میں پہنچیں۔ اور لکھنؤ کے مجاہدین نے بھی فوج سے اپیل کی۔ اس وقت لکھنؤ کا چیف کمشنر سر ہنری لارنس تھا۔ اور اسے فوجوں میں انگریزی حکومت کی وفاداری کے جذبات کا پورا اعتماد تھا۔ لیکن ۲ رمئی کو ہنری لارنس کو مطلع کیا گیا کہ اودھ کی ساتویں بے ضابطہ انفنٹری نے نہ صرف کارتوسوں کو منہ سے توڑنے سے انکار کر دیا ہے بلکہ وہ کسی سخت سے سخت حکم پر بھی تعمیل کے لئے آمادہ نظر نہیں آتے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام بغاوت کے آثار رونما ہو رہے ہیں۔ اور سپاہی تشدد پر آمادہ ہیں۔ ہنری لارنس نے غیظ وغضب میں ہر ممکن جبر و تشدد کا حکم دے دیا گورا پلٹن کے سپاہی دیسی سپاہ کو تعمیل حکم پر مجبور کرنے کے لئے بندوقیں تان کر مقابلے کے لئے پہنچ گئے۔ اس پر بہت سے دیسی سپاہی ہتھیار پھینک کر فرار ہو گئے اور باقی ڈیڑھ سو نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن تعمیل سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ انھیں فوجی ضابطے کے مطابق سزائیں دی گئیں اور مفرور سپاہی احمد اللہ شاہ کی جمعیت میں شامل ہو گئے۔

چوبیسویں رجمنٹ پر ظلم وجور

۸ رمئی کو منگل پانڈے کی رجمنٹ نمبر ۳۴ کو بارک پور میں برخاست کر دیا

گیا - رائس ہومز نے اپنی "تاریخ بغاوتِ ہند" میں بیان کیا ہے کہ "ان سپاہیوں کو صرف موقوف نہیں کیا گیا بلکہ ان سے وہ وردیاں بھی چھین لی گئیں جن کی قیمت ان کی تنخواہوں سے وضع کی گئی تھی - اور جو اتنے عرصے کی خدمات اور عرق ریزی کی کمائی میں ان کا واحد سرمایہ تھیں - لیکن انھوں نے اس پر بھی اپنی گلو خلاصی کو غنیمت سمجھا اور ببیک بینی و دو گوش چھاؤنی سے چپ چاپ رخصت ہو کر اطمینانِ قلب سے اپنے گھروں کو چلے گئے - جہاں سے وہ کچھ عرصہ بعد ہمارے دشمنوں کے باغی گروہ میں شامل ہو گئے"

حکومت کا یہ سلوک نہایت جابرانہ تھا - جو سخت سزا کے طور پر روا رکھا گیا تھا - اس برخاستگی کے حکم اور تشدد آمیز سلوک کو تمام ہندوستانی چھاؤنیوں میں سنایا گیا - مقصد یہ تھا کہ دوسرے سپاہیوں کو اس سے عبرت حاصل ہوگی اور وہ خوف زدہ ہو کر نافرمانی سے باز رہیں گے - لیکن اس کا اثر اس کے خلاف ہوا جو لازم تھا - جہاں جہاں یہ حکم سنایا گیا سپاہیوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف غم و غصہ اور اپنے بہادر بھائیوں سے ہمدردی پیدا ہوئی - سب نے ان کے جرأت مندانہ اقدام کو سراہا اور انکی تقلید کرنے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہو گئے -

تشدد اور ملک بھر میں آگ کے شعلے

دراصل کارتوسوں کے استعمال سے انکار اور اس کے ذریعے مذہبی مداخلت کا خیال کوئی دانش مندانہ فعل نہیں سمجھا جا سکتا - کیونکہ چربی کے بارے میں یہ شبہ یقین

کی حد میں داخل نہ ہو سکا تھا کہ آیا اس میں گائے کی چربی ہے یا سؤر کی، یا صرف بکری کی چربی لگائی ہے۔ لیکن انگریز حکام کا تشدد اور معمولی شکایات کی شنوائی سے انکار نیز کارتوس کے استعمال پر ضد اور غیر انسانی جبر و سختی نے سپاہیوں کے دلوں میں ایک طرف تو اسی شبہے کو پختہ کیا کہ یہ چربی انھیں بے دین بنانے کے لئے ارادتاً لگائی گئی اور اسی لئے منہ سے استعمال کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف حکومت کے ناروا طرزِ عمل انھیں کو اپنی بے بسی اور غلامی کا یقین دلایا۔ اور نفرت بڑھ گئی۔

ان کے علاوہ کارتوس محض حیلہ بن گئے۔ ورنہ انقلابی جماعت جو سیاسی وجوہ کی بناء پر آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھی ہر طرف فوجوں کو حریت پسندی کے جذبات سے آشنا کر رہی تھی اور غیر ملکی استبداد کے خلاف نفرت پھیلا رہی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی جدوجہد ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ عام شہریوں کے علاوہ فوجوں میں وطن کی آزادی کا شعور ترقی پر تھا۔ اور وہ انگریزوں کی معمولی حرکات پر چونک کر شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی شعور نے عوام کو اپنی اقتصادی بدحالی پر زیادہ سے زیادہ متوجہ کیا۔ انگریز کی معاشرتی و رسمی مداخلت کو بڑھتی ہوئی غلامی کی مصیبت سمجھا۔ انگریزوں نے عوام سے میل جول اپنے لئے ننگ و عار سمجھا اور اپنا ابتدائی رویہ بدل کر ہر ہندوستانی کو کالا آدمی کہہ کر ذلت کی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ خود صاحب بہادر کہلانے لگے اور "کالا آدمی" کے خیالات و جذبات سے ناواقف رہے۔ یہ حکومت کا بڑھتا ہوا نشہ تھا جس نے انھیں مست و غافل کر کے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ

وہ اپنی محدود قوت کے بل بوتے پر عظیم ملکِ ہند کے مالک بنے ہیں۔ اب اس کے باشندوں کو ہر طرح مرعوب و خائف کر چکے ہیں۔ اور اسی طرح کچل کر رکھ سکتے ہیں۔ چونکہ صاحب بہادر، عام سطح پر آنا بے عزتی سمجھتے تھے اس لئے انھیں عوام کی حالت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ اور نہ ملکی سیاست کا بغور جائزہ لینے کا موقع ملا۔ انقلابی جماعت کی سرگرمیوں کا بھی پورا اندازہ کرنا ان کے لئے دشوار تھا۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں غیر ملکی تسلط اور اس کے اثرات سے پیدا ہونے والے مسائل و مصائب نے جو پھوڑا بنایا تھا وہ اندر ہی اندر پکتا رہا۔ نئے حاکموں نے اس کی صحیح تشخیص کی، نہ علاج ـــ بلکہ ہر ممکن طور پر ان کے زخموں پر نمک پاشی کی کوشش کی۔

"غدر" یا "جنگ آزادی" کیوں؟

عوام کی دوسری روایات کی اشک شوئی ہو سکتی تھی۔ اگر انھیں پیٹ بھر روٹی ملتی رہتی لیکن افلاس اور فاقہ کشی بڑھتی رہی۔ ملک کی اقتصادی بدحالی اور مفلسی کا نقشہ سر سید احمد خان نے "اسباب بغاوتِ ہند" میں اس طرح پیش کیا ہے۔

"جب افغانستان سرکار (حکومت انگریزی) نے فتح کیا۔ لوگوں کو بڑا غم ہوا۔ جب گوالیار فتح ہوا، پنجاب فتح ہوا۔ اودھ لیا گیا۔ لوگوں کو کمال رنج ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ ان کے پاس کی ہندوستانی عملداریوں سے ہندوستانیوں کو بہت آسودگی تھی۔ نوکریاں اکثر ہاتھ آتی تھیں۔ ہر قسم کی ہندوستانی اشیاء کی تجارت بہ کثرت تھی۔ ان عملداریوں کے خراب ہونے سے زیادہ افلاس اور محتاجی ہوتی تھی۔"

تقریباً ایک سو سال کی مدت سے ہندوستان کی صنعت و تجارت کی ترقی کے خلاف انگریزوں نے جبر و سختی اختیار کرنا شروع کر دی تھی، اہل فرنگ کا اٹھارھویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے اہل حرفہ پر ظلم و تشدد کا جو عالم تھا اس کی مختصر تفصیل خود انگریز مورخین کے قلم سے اس طرح بیان کی گئی تھی۔

بورڈس لکھتا ہے "کپڑا بننے والوں پر جرمانے کئے جاتے ہیں۔ ان کو قید اور کوڑوں کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ جبریہ تجارتی عہد ناموں پر دستخط کرا لئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کی صنعتیں نابید ہو رہی ہیں۔ اور جو کوئی رہ گئی ہیں وہ بہت زیادہ مہنگی ہیں۔ عہد مغلیہ اور مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں یہ لوگ مطمئن اور خوش و خرم تھے۔ مگر اب تباہ حال نظر آتے ہیں۔"

یہ مظالم سب سے زیادہ بنگال میں کئے گئے جہاں ریشمی کپڑے کی صنعت اتنی ترقی پر تھی کہ یہاں کے کپڑے نے انگلستان میں پہنچ کر اس کا بازار سرد کر رکھا تھا۔ انگریز حاکموں نے بنگال کے پارچہ بافوں کے ہاتھ اور انگوٹھے تک کٹوانے سے دریغ نہ کیا۔ اور اس طرح صنعت و تجارت کو تباہ و برباد کر کے ملک کو افلاس کے گڑھے میں جھونک دیا۔ ان سب تباہیوں اور خستہ حالیوں کا مسلسل اندازہ کر کے ملک کے مدبرین اور سیاسی رہنماؤں نے جن میں مسلمان پیش پیش تھے غیر ملکی تسلط کے خلاف انقلابی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ انگریز حکام ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کو غدر کہنے کے باوجود اسلامی جد و جہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ مٹکاف لکھتا ہے:۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غدر اس قومی تحریک کا نتیجہ ہے جس کا مقصد غیر ملکی حکومت سے ہندوستان کو آزاد کرانا اور اسلامی حکومت کو از سرِ نو قائم کرنا مقصود تھا۔"

ایک اور مقام پر یہی انگریز اپنے بیان کی تائید میں لکھتا ہے :۔

"کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ غدر خالص طور پر اسلامی بغاوت تھی"

ایک اور بیان میں اس نے لکھا ہے :۔

"مسلمان اپنی قدیم جنگی روایات کے لحاظ سے اپنے سلاطین کی گزشتہ عظمت کے خواب دیکھنے میں مصروف تھے اور اپنی سلطنت کی بحالی کیلئے دعائیں مانگتے رہتے ۔"

جنرل اوٹرم کہتا ہے :۔

"بغاوت کی تحریک کا آغاز بہت مدت پہلے مسلمانوں کی طرف سے ہوا تھا"

غرض یہ انقلابی جدوجہد جس کی ابتدا اور تنظیم میں مسلمان اکابر کا ہاتھ تھا اور انھوں نے اپنے ساتھ ملک کے دوسرے فرقوں کو بھی متحد کر لیا تھا تقریباً ایک صدی سے ملک کے اطراف و جوانب میں جاری تھی۔ لیکن کمپنی کی حکومت کو اس کا صحیح علم نہ تھا۔ جب کبھی کسی مقام پر کوئی ہنگامہ یا شورش ہوئی حکام نے اسے وقتی فساد سمجھ کر دبانے کی کوشش کی پھر اس سے غافل ہو گئے"

۱۸۵۷ء میں جیسا کہ مندرجہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہو چکا ہے حالات نے ایسی صورت اختیار کی کہ اب تمام فرقوں نے ضروری سمجھا، اس جابرانہ حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے جلد سے جلد مناسب کارروائی کی جائے۔ اتفاقاً کچھ واقعات اس زمانے میں ایسے رونما ہوئے جن کی وجہ سے دیسی فوجوں میں انتشار اور بے چینی اِک دم بڑھ گئی ۔۔ان میں سب سے اہم معاملہ گائے اور سوٴر کی چربی کے کارتوسوں کا تھا۔ اسے رفع دفع کرنے کے لئے انگریز افسروں کی طرف سے روایتی

حکمتِ عملی اور دانائی سے کام لینے کی بجائے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جن سے دیسی سپاہیوں کے جذبات اور زیادہ مشتعل ہو گئے۔

انگریزوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا اس کا منشا فوجی نظم و ضبط قائم کرنا اور سپاہیوں کو ڈرا دھمکا کر مطمئن و خاموش رکھنا تھا — انقلابی تحریک کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے ۱۸۵۷ء میں عروج پر پہنچ رہا تھا۔ انگریز اس کی تہ سے اب تک ناواقف تھے۔ لکھنؤ۔ کانپور اور روہیل کھنڈ وغیرہ کے ہنگاموں کو وہ ذاتی اغراض کی بنا پر معمولی شخصی شورش سمجھ رہے تھے اور جس طرح اس سے پہلے انھوں نے کئی ریاستوں کی ضبطی کے موقع پر وہاں کے حکمرانوں کی ناراضی کو کچل کر امن قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ یا بعض مقامات پر فوجی یا نیم سپاہی بغاوتوں کو فرو کر چکے تھے۔ اس موقع پر بھی سمجھتے تھے کہ جبر و سختی سے دبا کر ہر جگہ امن بحال کر لیں گے۔

بعض انگریز فوج افسروں نے اپنی خفیہ رپورٹ میں حکومت کو مطلع کیا تھا کہ ہندوستان میں چند انقلابی جماعتیں فتنہ و فساد برپا کر رہی تھیں اور چند خفیہ خطوط اور جاسوس جو گرفتار کئے جا چکے تھے ان سے اس راز کا انکشاف کیا تھا کہ:-

"۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستان میں ایک عظیم ملک گیر انقلاب رونما ہونے کی توقع کی جا رہی ہے۔"

میرٹھ کے بریگیڈیر ولسن نے اس امر کی تصدیق کی ہے۔

میرٹھ اور انقلاب ہند

کیئی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ :-

"معتبر شہادتیں اس بات کی ملتی ہیں کہ ہندوستان میں انقلابی جماعتوں نے ایک عام ہنگامہ برپا کرنے کے لئے ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء معین کر رکھی تھی۔ تمام چھاؤنیوں میں اس کی اطلاع تھی۔ گو سپاہیوں کو اس کا علم وثوق سے کوئی نہ تھا۔ کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ مگر تمام رجمنٹیں اس سے خبردار تھیں کہ کوئی ہنگامہ ہوگا۔ اور جو کچھ ایک رجمنٹ کرے گی وہی ساری رجمنٹیں کریں گی۔ اس ہنگامے میں جیل خانوں کو توڑنا۔ قیدیوں کو آزاد کرنا اور انگریزی افسروں، سپاہیوں کو قتل کرنا شامل تھا۔"

کرنل کارمائیکل سمائستھ نے جو میرٹھ کیمپ کا ایک نہایت مغرور اور جابر افسر تھا (اور اسی کے اشارے پر میرٹھ کی دیسی چھاؤنی میں ہنگامے کا آغاز ہوا) جنگ چھڑ جانے کے بعد اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ "اس برصغیر میں ۳۱ مئی کو ایک بھاری ہنگامہ ہونے والا تھا میں نے اس سازش کا کھوج لگا کر اس کا قلع قمع کر دیا اور اپنی حکومت کو انقلاب عظیم کا سامنا کرنے سے بچا لیا۔"

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر سمائتھ کو واقعی کسی ایسی سازش کا علم ہوا تھا تو اس نے اپنے ساتھی افسروں کو بروقت مطلع کیوں نہ کیا۔ اور اتنے اہم راز میں اپنے کمانڈنگ افسر اور دوسروں کو کیوں شریک نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمائستھ بذات خود غلط اور غیر معتبر آدمی تھا۔ اور ہنگامہ ہو جانے پر جب اس کی غلطی پر افسروں نے اسے مطعون کیا تو اس نے دوسروں کی سنی سنائی کی بناء پر یہ حیلہ سامنے رکھ کر اپنے سر سے الزام دور کرنے کی کوشش کی اور مفت کی داد بھی حاصل کرنا چاہی۔

کرنل سمائستھ کے حلقہ بگوشوں میں ایک کم اصل شخص برجموہن تھا۔ اس کا باپ سؤر چراتا تھا۔ وہ ایک پلٹن میں سپاہی تھا جہاں سے چوری کے جرم میں سزایاب ہو کر

برخاست کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ کمینہ خصلت ہونے کے سبب سمائتھ کا منہ چڑھا تھا اور ہر وقت اس کے بنگلے پر رہا کرتا۔ سمائتھ نے اسے دوبارہ سواروں میں ملازم کرا دیا۔ برجموہن سمائتھ کے اشارے پر چلتا۔ ۲۳ اپریل کو سمائتھ نے اچانک دیسی فوج کے منتخب سواروں کو ۲۴ کی صبح پریڈ پر حاضری کا حکم دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان سب سے صف بہ صف چربی کے کارتوس استعمال کرائے جائیں۔ تمام سواروں نے پہلے ہی آپس میں عہد کر لیا تھا کہ وہ یہ رائفلیں اور کارتوس استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن اس چھاؤنی میں نئے رائفلیں اور نئے کارتوس تقسیم نہیں کئے گئے تھے اس لئے سواروں کو پریڈ کے حکم سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ علاوہ بریں کارتوسوں کے بارے میں زیادہ تر ہندو سپاہیوں کو شکایت اور اعتراض تھا۔ مسلمان سپاہی اس مسئلے کو زیادہ اہم اور شدید نہ سمجھتے تھے۔

کپتان کریگ کو جب کرنل سمائتھ کے اس حکم اور ارادے کی خبر ہوئی تو اس نے کرنل اجوٹنٹ کو لکھا کہ "تم فوراً کرنل کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہندو سپاہ کارتوسوں کے استعمال پر خاصی برافروختہ ہے اور اس سلسلے میں کئی جگہ احتجاج ہو چکا ہے۔ میرٹھ چھاؤنی میں اس قسم کا ہنگامہ کھڑا نہ کرے۔ اور پریڈ ملتوی کر کے فی الحال اس ارادے سے باز آجائے۔ ورنہ ہماری رجمنٹ بدنام ہو گی۔ یہ معاملہ بہت سنگین اور غور و خوض کا محتاج ہے اس لئے عجلت سے کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔"

سمائتھ کی خود پسندی اور ضد نے اس پر کوئی توجہ نہ کرنے دی اور وہ اپنے فیصلے پر مستعدی سے قائم رہا۔ چونکہ میرٹھ کیمپ دوسرے کئی مقامات سے

زیادہ مختلف تھا۔ وہاں انگریز افسروں کی تعداد کے علاوہ گورا پلٹن بھی خاصی تھی۔ اس لئے اُس نے سوچا کہ اس موقع پر پریڈ کے حکم کا التوا نہایت بزدلانہ اقدام ہوگا۔ اور دیسی سپاہیوں کی ناراضی کی دھمکی سے مرعوب ہو جانے کے باعث ان میں خودسری بڑھے گی۔ اور کمانڈنگ افسر کو اس موقع پر اُس نے بالکل بے خبر رکھا۔ کہ کہیں وہ مداخلت نہ کرے۔

۲۴ اپریل کی صبح کو نوّے سوار فوجی میدان میں صف بستہ ہوئے۔ اور کرنل سمائتھ نے انہیں نئے اسلحہ اور کارتوس کے استعمال کی تفصیل بنا کر بتایا کہ فوجی ضابطے کے ماتحت ہر فوجی پر اس کا استعمال فرض ہے۔ سب سے پہلے برجموہن نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے بعد اور چار آدمیوں نے رضامندی ظاہر کی۔ بقیہ پچاسی آدمیوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد پریڈ منسوخ کر دی گئی اور فوجی تحقیقاتی عدالت کے سامنے ان مجرموں کو پیش کیا گیا جن کے خلاف کرنل کے حکم اور فوجی قانون اور نظم و ضبط کی خلاف ورزی کا الزام تھا۔ فوجی عدالت کی رائے میں سواروں کا طرزِ عمل کلیتہً رائے عامہ کے خوف کی بنا پر تھا۔ یعنی وہ اس ڈر سے یہ کارتوس استعمال کرنا نہیں چاہتے تھے کہ عوام میں ان کے بارے میں بدظنی پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ کمانڈر انچیف نے فیصلہ کیا کہ ان کی سماعت دیسی افسروں کی فوجی عدالت کے سامنے ہونی چاہیئے۔ گو انگریزی افسروں سے کسی خاص انصاف کی توقع نہ تھی لیکن ان سپاہیوں کو خیال ہؤا کہ دیسی افسر خصوصیت سے اپنے اعلیٰ افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انصاف کا خون کریں گے۔ اس عدالت میں بھی ایک انگریز افسر نگرانِ اعلیٰ کی حیثیت سے شامل تھا۔ جس کی رائے

اور قانونی لیاقت تمام عدالتی افسروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

مبینہ ملزموں نے اپنے جرم سے انکار کیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ کسی ملزم نے جرح نہیں کی لیکن تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ غلط ہے بلکہ کئی ملزموں نے افسروں سے مدّمقابل ہو کر معقول جرح کی۔ سب سے پہلے سب نے بالاتفاق نہایت صفائی سے ایک آواز میں لفٹننٹ کلارک کی شہادت کو جھوٹ اور افترا پردازی بتایا۔ اس کے علاوہ کئی ملزموں نے خوب خوب بحث کی۔ نائک قدرت علی نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے کرنل سمائتھ سے متعدد سوالات کئے۔ بالآخر تمام ملزموں کو دس دس سال با مشقت کی سزا دے دی گئی۔

لیکن یہ عدالت غیر جانب دار تھی۔ اور فیصلے میں بھی متفق الرائے نہ ہو سکی۔ عدالت کے پندرہ ارکان میں سے بعض نے سزا کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ ملزموں کے سابقہ چال چلن اور مدتِ ملازمت کا لحاظ ضرور کیا جائے۔ نیز اس بات کو ضرور پیشِ نظر رکھا جائے کہ ان کا قصور دانستہ نہیں بلکہ اس بدظنی اور غلط فہمی کی بنا پر ہے جو کارتوسوں کے بارے میں عام طور پر پھیل چکی ہے۔

ڈویژنل کمانڈر جنرل ہیوٹ نہایت سُست اور آرام پسند طبیعت کا آدمی تھا۔ لیکن جب اُس نے معاملے کی اہمیت پر غور کر کے ساری کاروائی کا معاینہ کیا تو وہ جرم کی نوعیت کا صحیح اندازہ کر کے سزائیں تخفیف کرنے پر مجبور ہوا۔ لیکن اعلیٰ حکام کا اثر غالب رہا اور اس کے باوجود صرف گیارہ

آدمیوں کی سزا میں ان کی عمر کے لحاظ سے کچھ کمی کی گئی۔

میرٹھ چھاؤنی کا فیصلہ

ہومز کے بیان کے مطابق "۹ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو جب آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ تمام افواج کو بلا کر جمع کیا گیا تاکہ وہ ان بدنصیب ملزموں کی خستہ حالی اور عبرتناک سزا کا منظر دیکھیں۔ بندوقوں اور سنگینوں کے پہرے میں تمام ملزموں کو باوردی لایا گیا۔ سب کے سامنے ان کی وردیاں پیچھے سے پھاڑی گئیں۔ اور لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ ہتھکڑیاں، بیڑیاں تیار کر کے ان کے ہاتھوں، پاؤں میں ڈالیں۔ لوہاروں نے اس کام میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف کیا اور ساری دیسی فوجوں نے اپنے ساتھیوں کو اس غمزدہ اور اذیت ناک حالت میں ذلیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ گو وہ خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کے دلوں کی جو حالت ہو گی اس کا اندازہ دشوار نہیں، ملزموں کی صف میں تمام منتخب اور اعلیٰ صفات کے آدمی تھے۔ جنھوں نے کوئی اخلاقی جرم نہ کیا تھا۔ مگر مجرم بننے پر مجبور تھے۔"

ایک انگریز فوجی افسر جو اس موقع پر موجود تھا لکھتا ہے کہ "اس وقت افواج کے افسروں اور مختلف عہدہ داروں میں بڑی سنسنی پائی جاتی تھی۔ وہ کچھ سرگوشیاں بھی کرتے نظر آئے۔ اگر انگریزی فوج کے دستے ان کی نگرانی نہ کرتے ہوتے تو گمان غالب ہے کوئی ہنگامہ اسی وقت بپا ہو کر رہتا۔"

تمام ملزموں کو دست و پا بجولاں کرنے کے بعد جیل خانے بھیجا گیا اور

بقیہ افواج کے دستے چھاؤنی واپس بھیج دیے گئے۔ جو سب کے سب خاموشی سے چلے گئے۔

ملزموں کی حالت ناگفتہ بہ تھی ان کے چہروں سے شدید رنج و غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں اپنی گزشتہ خدمات اور موجودہ تکلیف دہ حالت کا خیال آ رہا ہے۔ ان میں بہت سے ایسے عمر رسیدہ سپاہی بھی تھے جنہوں نے حکومت کے لیے بڑی بڑی اہم لڑائیاں لڑی تھیں، اور اپنی دلیری و اولوالعزمی کے سہارے بڑے معرکے سر کئے تھے، جس کے عوض ان کے سینے دلاوری کے امتیازی نشان اور تمغوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر آج ؛ نہیں سب اتار کر کس مپرسی کے عالم میں پابجولاں جیل خانہ جانا پڑا تھا۔ وہ اپنی جانبازی کا یہ صلہ پا کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دئے۔ اور گڑگڑا کر افسروں سے رحم کی درخواست کرنے لگے۔ ان سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اور اب وہ بے دست و پا قیدی تھے۔ جن کی کوئی شنوائی نہ کی گئی۔ انھیں دیکھ کر جوان سپاہی بھی رو دیے تھے۔"

یہ افسر لکھتا ہے کہ "میں نے اپنی عمر میں اس سے زیادہ عبرتناک اور دلدوز نظارہ نہیں دیکھا۔ میں اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں۔ کہ میں ان کے غم میں تہ دل سے شریک تھا۔ اس وقت ان کی نظروں میں اس واقع کا انجام نہ تھا اور نہ ہم میں سے کوئی اس سے خبردار تھا۔"

سارا دن اسی طرح گزرا۔ کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ رات بھی اسی خاموشی سے گزر گئی۔ دوسرے دن صبح یعنی ۱۰ مئی اتوار کو ہر طرف سکوت

طاری تھا۔ سب سپاہی چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں سے بعض وکیلوں کے پاس بھی گئے تاکہ معلوم کریں، ان کے ساتھیوں کی اس مصیبت کے ٹالنے کے لئے کوئی اپیل ممکن ہے۔

۹ رمئی کی رات کو ایک دیسی افسر نے اپنے انگریز افسر سے شبہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے فوج میں بغاوت ہو جائے۔ مگر انگریز افسر نے جب کرنل کارمائیکل سمائیتھ سے اس کا ذکر کیا تو اُس نے اسے سختی سے ڈانٹا کہ "ایسی بے بُر افواہ پر کان نہ دھرو۔ یہ سب بکواس ہے۔ بغاوت کی کون ہمت کر سکتا ہے" ——— بریگیڈیر ولسن نے بھی سمائیتھ کے خیال کی تائید کی۔

میرٹھ شہر کے بازاروں میں اس حادثے کی اطلاع زور شور سے گشت کر رہی تھی۔ تمام فوجی ملزم جیل خانے کی کوٹھڑیوں میں بیڑیوں سے لدے ہوئے بند پڑے اپنی مصیبت کا اندازہ کر رہے تھے۔ اور سارے شہر میں مختلف افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔

ایک خادمہ نے کسی کشمیری لڑکی کی زبانی سنا کہ اس کی ماں نے اسے بتایا ہے، دو ہزار بیڑیاں تیار کی جا رہی ہیں۔ عنقریب تمام دیسی فوجوں کو موقوف کر کے سپاہیوں کو یہ بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔ لیکن شہریوں نے ان افواہوں پر کوئی توجہ نہ کی۔ تمام دکانیں حسب معمول کھلی تھیں۔ سڑکوں اور بازاروں میں عام چہل پہل نظر آتی تھی۔

پانچ بجے سہ پہر کے قریب اچانک ایک ہلچل مچ گئی۔ چھاؤنی میں ایک باورچی لڑکا سپاہیوں کی بارکوں کی طرف دوڑتا ہوا یہ کہتا سنائی دیا کہ "پیدل

اور سواروں کے دستے ہزاروں کی تعداد میں ہلّہ کئے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں قدرتاً ایسے وقت پر ہر شخص ذاتی حفاظت کا خیال کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے بچاؤ کے لیے جس کی سمجھ میں جو کچھ آیا اُس نے وہی کیا۔ اِس اثناء میں تیسری سوار پلٹن کے سوار تیزی سے گھوڑے دوڑا کر جیل خانے کی طرف جھپٹے۔ اور آناً فاناً انھوں نے اپنے ساتھیوں کو رہا کرا لیا۔ باغی ..... بعض با وردی تھے اور بعض بے وردی۔

بیسویں اور گیارھویں دیسی انفنٹری کے سپاہی بے چینی سے پریڈ پر جمع ہو کر اور خطرہ کی گھنٹی پر افراتفری میں دوڑنے بھاگنے لگے۔ دکاندار دکانیں جلد جلد بند کرنے لگے۔ شہر کے غنڈوں نے کہیں کہیں لوٹ مار بھی شروع کی۔ رات ہو گئی۔ اور نو بجے قریب کے علاقوں کے دیہات سے گوجروں نے شہر میں ہلّہ بول دیا۔

سورما کرنل سمائتھ اپنی رجمنٹ کے افسروں کو خبردار رہنے کی ہدایت کر کے چپ چاپ نہایت دلیرانہ موقع سے فرار ہو گیا۔ وہ پہلے کمشنر کے پاس گیا۔ اسے اِس حادثے کی اطلاع کر کے بریگیڈیر ولسن کے پاس پہنچا۔ اور کمانڈنگ افسر کی خدمت میں حاضر ہو کر بڑے اطمینان سے اس کی پناہ میں رات بھر آرام کرتا رہا۔ دوسرے انگریز افسروں نے بزدلی سے کام نہ لیا۔ اور حالات پر قابو پانے کے لئے جرأت و دلیری سے موقع پر مستعد رہے۔ ان میں خصوصاً یہ افسر اپنی حکومت کے آڑے آئے۔ میجر ٹاجس، یہ توپخانے کا حاکم اعلیٰ تھا اور جنگِ آزادی کے دوران دہلی کی چار دیواری کے مورچوں پر بڑی جرأت سے لڑا۔

—— دوسرا جو نمبر تھا جس نے دہلی کے جدال و قتال کی سرکردگی کی ۔
بریگیڈیر آرکڈل ولسن جو دہلی کے محاذِ جنگ میں حکومت کی فتحیابی کا ضامن ہوا ۔ بعض افسر ایسے بھی تھے جو موقع سے گریز ہی کرتے رہے ۔ ان میں سب سے زیادہ تو خود سمائتھ تھا اور دوسرا جنرل کمانڈنگ ہیوٹ جو ستر سال کا بڈھا ہونے کی وجہ سے پیش قدمی نہ کر سکا ۔ ساری چھاؤنی میں اس وقت ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی کہ سواروں کو گھوڑے ہاتھ نہ آتے تھے ۔ بہت سے سپاہی اسلحہ اور سامانِ حرب حاصل نہ کر سکے ۔ جو کچھ جسے مل سکا اور جس کا جدھر منہ اٹھا چل پڑا ۔ اس کے باوجود اگر انگریز افسر ذرا توجہ اور ہمت و دانائی سے کام لیتے تو حالات کو قابو میں لانا زیادہ دشوار نہ تھا ۔ لیکن ہنگامے کا آغاز کچھ اتنا غیر متوقع اور اچانک ہوا تھا کہ سب سے زیادہ ہیوٹ اور بعض دوسرے انگریز افسر حیرت و استعجاب میں سراسیمہ ہو کر رہ گئے ۔ اور اک دم مار دھاڑ ایسی ہونے لگی کہ کسی کو سدھ بدھ نہ رہی —— چند دیسی سپاہیوں نے بعض انگریز افسروں کو جو بازار میں تھے دوڑ کر حالات سے خبردار کر دیا اور انھیں اتنا ہی موقع مل سکا کہ اپنی اپنی جانیں بچا لیں ۔

جب تیسری سوار پلٹن جیل خانہ پہنچی اور بیسویں اور گیارھویں رجمنٹیں پریڈ پر جمع ہوئیں تو کرنل فنس جھپٹ کر موقع پر پہنچ گیا اور اس کی نصیحت اور صلح صفائی کی باتوں سے قیام امن کی توقع ہونے لگی ۔ حتیٰ کہ بیسویں انفنٹری جو سب سے زیادہ برافروختہ تھی صلح پسندی پر آمادہ نظر آنے لگی لیکن اسی دوران میں تیسری سوار پلٹن کا ایک آدمی گھوڑا دوڑاتا چیختا چلاتا آ پہنچا کہ بہت سے

انگریز افسر اور سپاہی ہمارے مقابلے کے لئے آرہے ہیں۔ اس پر ہنگامہ حد سے تجاوز کر گیا۔ اتنے میں ایک رنگروٹ[1] نوجوان نے کرنل فنس کی طرف گولی چلادی۔ اور وہ وہیں گر کر مر گیا۔ یہ گیارھویں انفنٹری کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس کے مارے جانے پر یہ پلٹنیں بے سرے ہو کر قابو سے باہر ہو گئے۔ لیکن ان میں کسی پلٹن نے اپنے افسروں کو کوئی زک پہنچانے کی کوشش نہ کی۔ وزیر علی خان ڈپٹی کلکٹر میرٹھ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ "گو اس دن رات بھر لوٹ مار جاری رہی۔ لیکن اس میں کوئی سپاہی شریک نہ تھا۔ نہ ان میں سے کسی نے کسی کی جان لی اور نہ کسی کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ البتہ بعض متعصب اور مغرور انگریز افسروں کے بنگلوں کو ٹولیوں کو آگ ضرور لگائی۔ باقی لوٹ مار کی ذمہ داری عام شہری غنڈوں اور گوجروں پر تھی۔ بہت سے شہریوں نے انگریز فوجی اور شہری افسروں کے عورتوں بچوں کو پناہ دی۔ کئی جگہ کچھ عیسائی اور انگریز خاندان آباد تھے ان کی حفاظت بھی ہندوستانیوں نے کی۔ ایک شخص اصغر علی کے مکان سے متصل ایک عیسائی خاندان ان کے مکان میں کرایہ پر رہتا تھا۔ جب باغیوں نے اس عیسائی کے گھر کو گھیر کر لوٹ مار کا ارادہ کیا تو اصغر علی نے اس عیسائی کنبے کے تمام افراد کو اپنے گھر میں پناہ دی حالانکہ باغیوں نے اصرار کیا اور دھمکی کہ اگر وہ ان لوگوں کو ان کے حوالے نہ کریں گے تو خود ان کا مکان بھی لوٹ لیا جائے گا۔ لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی

---

[1] کہا جاتا ہے کہ اس نوجوان کے فنس پر گولی چلانے کا سبب یہ تھا۔ کہ کسی نے اس پر گولی چلائی تھی اور اس نے جوابی حملہ کیا۔

اور سمجھا بجھا کر سب کو وہاں سے رخصت کر دیا۔

ہندوستانی عوام اور باغی سپاہی اس ہنگامے کے باوجود رواداری کو ہاتھ سے نہ جانے دے رہے تھے لیکن گورا پلٹنوں اور ان کے افسروں نے انھیں گھیرنے اور سختی سے مقابلہ کرنے کی تدبیریں کیں۔ آخر گولیاں چلنے لگیں اور اب صورتِ حال قابو سے قطعًا باہر ہو گئی۔

باغی سپاہی انگریزی فوجوں کے نرغے میں گھرتے جا رہے تھے آخر انھوں نے حالات کا اندازہ کر کے مناسب سمجھا کہ میرٹھ میں انگریزوں کا مقابلہ کرنا مناسب نہیں چنانچہ تمام دیسی افواج رسالے اور پیدل سب کے سب شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور تہیہ کر لیا کہ راتوں رات مسافت طے کر کے سیدھے دہلی چلیں جہاں شہنشاہ بہادر شاہ کے سامنے حاضر ہو کر فریاد پیش کریں اور امداد کے طالب ہوں۔ ورنہ خطرہ تھا کہ کہیں انگریز فوجیں انھیں گھیر کر قابو میں نہ کر لیں اور ان کی شورش یونہی ناکام ہو جائے۔

آزاد فوج کے سامنے ان بھائیوں کا انجام بھی تھا جو اس قسم کی معمولی بغاوتوں کے موقع پر دیکھنے میں آ چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ دہلی کی طرف روانگی فوجوں کے پروگرام میں پہلے سے شامل تھی۔ گوجروں کے کچھ گروہ فوجوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اور کئی جماعتیں جن میں شہر کے بہت سے غنڈے شریک تھے، چھاؤنی اور شہر کے بازاروں اور محلوں میں قتل و غارت کی گرم بازاری کرتے رہے۔

انگریز قطعًا بدحواس تھے اور ان میں پوری طرح مقابلے اور روک تھام

کی تاب نہ رہی تھی۔ اس لئے سب نے اپنی عورتوں اور بچوں کو دمدمے کے مقام پر جمع کر کے ان کی حفاظت کو غنیمت سمجھا۔ اور افسروں میں سے جس سے جو بن پڑا اُس نے اپنی جان کی حفاظت کے لئے کیا۔

دہلی چلو

بہر حال اس عظیم بغاوت ہند یا جہادِ آزادی کا اس طرح آغاز ہوا جو درحقیقت تاریخ ہند میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر انگریزی حکومت نے فتحیاب ہو کر اسے فوجی بغاوت یا غدر کے نام سے موسوم کیا۔

رات بھر میں یہ آزاد و باغی سپاہ ہزاروں کی تعداد میں تیزی سے کوچ کرتی ہوئی دہلی پہنچ گئی اور ۱۱ مئی کی صبح کو جب ابھی شہر پناہ کے دروازے بند تھے وہ انھیں توڑ کر شہر میں داخل ہوئی اور سیدھی لال قلعہ کے میدان میں صف آرا ہو گئی۔ اس عرصے میں انگریز افسروں نے دہلی کے حاکم اعلیٰ کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ

"ہندوستانی سپاہیوں نے غدر برپا کر کے دہلی کی طرف ہلّہ بول دیا ہے۔"

اور دہلی سے کمپنی کے صدر مقام کلکتہ کو گورنر جنرل کے پاس نیز جہاں جہاں ممکن ہوا گھبرا کر تار دوڑائے گئے۔ راستے میں کئی دیہاتی علاقوں کے بہت سے لوگ سپاہیوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اور آناً فاناً دہلی جنگِ آزادی کا میدان نظر آنے لگی انبالہ چھاؤنی میں جب یہ خبر پہنچی تو وہاں سے تمام فوجی چھاؤنیوں میں حسبِ ذیل پیغام تار برقی کے ذریعے سے ارسال کیا گیا:۔

"ابھی ابھی دہلی سے اطلاع آئی ہے ہمیں دفتر چھوڑنا پڑے گا۔

میرٹھ کے سپاہی تمام بنگلے جلا رہے ہیں ۔ وہ آج صبح وارد ہوئے ہیں ۔ پیغام رسانی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے ۔ آج پیغام نہ بھیجا جائے ۔ ہمارا خیال ہے کہ مسٹر ٹوڈ وفات پا گئے ۔ وہ صبح باہر نکلے اور ابھی تک واپس نہیں آئے ۔ ہم نے سنا ہے کہ نو انگریز افسر مارے گئے ۔ الوداع !"

دہلی اور جہاں جہاں یہ خبر پہنچی وہ مقام ہنگامہ زار بن گیا ۔ دراصل کمپنی کی حکومت کی بدنظمیوں اور بدسلوکیوں کے وار سے جو پھوڑا ہندوستان کے سینے میں پک رہا تھا وہ پھوٹ پڑا تھا ۔ اور عرصے سے جو انقلابی جدوجہد اندرونی طور پر جاری تھی اور جس کے ماتحت ایک وقت معینہ پر اعلانِ جنگ ہونا قرار پایا تھا کارتوسوں کے باعث میرٹھ سے قبل از وقت علانیہ شروع ہو گئی ۔ بعض مدبر انگریز افسروں نے میرٹھ چھاؤنی کے ظالمانہ برتاؤ کو اس ہنگامے کی بنیاد قرار دیا ۔ مسٹر ٹامسن نے لارڈ کیننگ کو مندرجۂ ذیل رپورٹ بھیجی اور اس بیدردانہ طرزِ عمل کے خلاف اظہار ناراضی کیا جو میرٹھ کی افواج کے اعلیٰ افسروں نے اختیار کر کے یہ ہنگامہ برپا کرایا ۔ اس نے لکھا :-

"حکومت کی معتدل پالیسی پر حرف گیری کرنا اور اُسے غدر کی بنیاد قرار دینا غلط ہے ۔ حقیقت میں اس آگ کا محرک وہ بیدردانہ سزا کا حکم ہے جو نہایت ذلیل طریقے سے میرٹھ کی چھاؤنی پر مسلط کیا گیا ۔"

آزاد فوج نے دہلی پہنچ کر بادشاہ بہادر شاہ کی شہنشاہی کا اعلان کرنے اور انھیں اپنی پناہ بنانے کی درخواست کی ۔ بادشاہ دل سے ملک اور رعایا کی آزادی اور خوشحالی کے خواہاں تھے ۔ لیکن وہ حکومت کی طاقت کو اچھی طرح سمجھتے تھے ۔

نیز انھیں اپنی پیرانہ سالی، بے طاقتی اور بے اختیاری کا اندازہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس بے سری فوج کی قیادت کی ان میں قوت نہیں۔ نہ اس کی تنظیم کا کوئی ضامن بن سکتا ہے۔ اس لئے موجودہ حالت میں اس بغاوت میں شریک ہونے سے ذلت وخواری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

چنانچہ جب باغی سپاہ چاندنی چوک میں جمع ہوئی تو بادشاہ نے مع شہزادوں کے وہاں پہنچ کر انہیں اس طرح خطاب کیا:۔

"بھائیو! میں جان و مال سے تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن میرے پاس نہ خزانہ ہے۔ نہ فوج نہ ملک۔ ہاں جب ملک مل جائے گا تو تم لوگوں کو عنایتِ خسروانہ سے نوازوں گا۔"

اس پر فوجیوں نے کہا "جہاں پناہ! ہم نہ ملک چاہتے ہیں نہ فوج، ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ حضور ہماری سرپرستی فرمائیں۔ ہم اپنی جانیں حضور پر قربان کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سارے ہندوستان میں حضور کی حکومت قائم کر کے ہمیشہ کے لئے نیک نامی حاصل کریں۔"

بادشاہ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

"تم لوگ جو کچھ چاہتے ہو۔ میری دلی آرزو بھی یہی ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے تمہارے واسطے بھی حاضر ہے۔ اسے کھاؤ، پیو اور ہمت کر کے دشمنوں کو ملک سے نکال دو۔ میرا سکہ جاری کر دو۔"

بہادر شاہ اپنی ضعیفی کے باوجود تیموری عزیمت و شجاعت کے وارث تھے لیکن انھیں ہندوستان کی آزاد فوج کی یکجہتی اور تنظیم پر شک تھا۔ اس لئے

شروع میں وہ جنگ وجدل کے خلاف تھے کہ کہیں رعایا و ملک کی تباہی نہ ہو۔

آخر ہنگامہ کارزار گرم ہوا۔ انگریزی فوج شکست کھانے لگی۔ کئی افسر مارے گئے۔ اس عرصے میں جنرل بخت خان نے اپنی بہادر جمعیت کے ساتھ بریلی سے آکر مجاہدین کی تنظیم شروع کی۔ بادشاہ بہادر شاہ کی شہنشاہی کا عام اعلان کر دیا گیا۔ اور سلطنت وشہر کا انتظام مناسب طور پر کیا جانے لگا۔ لیکن چند وطن دشمن غدار بادشاہ کی مصاحبت میں ایسے تھے جنھوں نے انگریزوں سے ساز باز کر کے بادشاہ اور مجاہدین کے ساتھ دغا بازی کی۔ اور ساتھ ہی ناتجربہ کار شہزادوں کو ورغلا کر بخت خان کی مخالفت پر آمادہ کر دیا۔ آخر ۱۹ ستمبر کو جیتی ہوئی بازی ہار دی گئی۔

شہنشاہِ مغلیہ کی جانب سے تمام نوابوں اور راجوں کو شاہی پروانے ارسال کئے گئے کہ "وہ برادرانِ وطن کا ساتھ دیں اور سب متحد ہو کر غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ کریں"۔ اس دوران میں یوپی۔ اودھ۔ روہیل کھنڈ۔ سابق صوبہ پنجاب۔ متوسط ہند۔ راجپوتانہ وغیرہ کل ہند میں جگہ جگہ مجاہدین نے متحدہ محاذ پر انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ لیکن چند بے وفا غداروں کے ہاتھوں پہلے دہلی۔ پھر اودھ اور رفتہ رفتہ کل ہندوستان میں حکومت انگریزی کی فتح ہوئی۔ انگریزوں نے ملک پر قبضہ کر کے کمپنی کی حکومت ختم کر دی۔ اور برطانوی حکومت کا اعلان کر کے ہندوستان کو غلام بنا لیا۔

بادشاہ کی دُور اندیشی نے ابتداء میں جس شبہ وخطرہ کا اندازہ کیا تھا وہی ہو کر رہا۔ بادشاہ پر مقدمہ چلا کر انھیں رنگون میں نظر بند کر دیا گیا۔ شہزادوں کو بیدردی سے قتل کر ڈالا گیا۔

برطانوی راج

دہلی میں مدتوں قتل عام اور لوٹ مار کرتے رہے۔ اور یہی حال لکھنؤ کا ہوا۔ باقی تمام علاقوں میں توپ اور گولیوں کے بل پر امن قائم کر دیا۔ اس کے بعد اس جنگِ آزادی کو غدر کے نام سے مشہور کیا۔ انگریز مورخوں اور ہندوستانی ادیبوں سے جھوٹی تاریخیں لکھوائیں اور مجاہدین کو غدار اور باغی موسوم کر کے ان پر بے بنیاد الزام لگائے۔ یہ سب کچھ حکومت کے زور اور ظلم کے بل پر کیا گیا۔

غدر نہیں جہادِ آزادی

یہ جنگِ آزادی ایک منظم تحریک کی بنا پر ملک کے رہنماؤں کی مدت مدید کی جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا اس کا آغاز وقت سے کچھ پہلے، اچانک ہو گیا۔ اس لئے افراتفری اور بدنظمی کی وجہ سے غداروں کو اپنی سازشوں کے جال پھیلانے اور حکومت کو خفیہ ہتھیار استعمال کرنے کا موقع آسانی سے مل گیا۔ دشواریوں کے باوجود مجاہدین اور تمام رہنما جس شجاعت اور دلیری سے حکومت کے توپ، گولوں اور جدید آلاتِ حرب کا مقابلہ کر کے کامیابی کے قریب پہنچ گئے وہ آزادی کی تاریخ میں بے مثال حقیقت ہے۔ جس سے خود دشمنوں کو بھی انکار نہیں۔ اور اسی لئے انھوں نے مجاہدین کو غدار کہ کر طرح طرح کی جھوٹی کہانیاں مشہور کیں۔ اور حاکمانہ اقتدار کی بدولت اس عظیم تحریکِ انقلاب کو "غدر" ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔

مجاہدین میں سے اکثر ملک و قوم کی خاطر قربان ہو گئے۔ اپنے گھر بار لٹا دئے۔ متعدد رہنما میدانِ کارزار میں عزیمت و شجاعت کے جوہر دکھا کر کام آئے یا ہزیمت کے بعد ہندوستان کی سرحد سے باہر چلے گئے اور کسی لالچ یا خود غرضی نے انھیں عمر بھر انگریز کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ نہ کیا۔

مجاہدین کی شکست اور فتح

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی تنظیم مسلمانوں کے زیرِ قیادت عمل میں آئی۔ اور آخر تک وہ میدان میں ڈٹے رہے۔ سربرآوردہ قائدین میں مولانا احمد اللہ شاہ، مارچ ۱۸۵۸ء میں بمقام لکھنؤ راجہ پوریاں کی دغا بازی سے عین لڑائی میں شہید ہوئے۔ حضرت محل لکھنؤ کی شکست کے بعد ماہ مارچ میں نواب برجیس قدر (اپنے بیٹے) اور ممو خان کی معیت میں نیپال کی سرحد میں چلی گئیں اور برطانوی حکومت کی لاکھ ترغیبات کے باوجود تاحیات مطیع نہ ہوئیں۔

عظیم اللہ خان تانتیا توپی دہلی کے شہزادہ فیروز شاہ۔ خان بہادر خان۔ نانا راؤ۔ جنرل محمود خان۔ مولوی لیاقت علی اور جنرل بخت خان دہلی اور لکھنؤ کے بعد اپنی اپنی مختصر جمعیتوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں حکومت کے خلاف مجاہدانہ سرگرمیوں میں مصروف رہے۔

رانی جھانسی مردانہ وار لڑتے ہوئے قلعۂ جھانسی کے باہر وطن پہ قربان ہوئی ان کے علاوہ بے شمار رہنما شمعِ حریت پر پروانہ وار نثار ہوئے۔

مندرجہ بالا مجاہدین میں سے جنرل بخت خان نے ۱۸۵۹ء تک مجادلہ جاری

رکھا اور ۱۲ رمئی کو ایک معرکے میں شہید ہوئے۔ تانتیا توپی اور عظیم اللہ خان نیپال کی لڑائی کی ناموافق آب و ہوا کی تاب نہ لا کر قضائے الٰہی سے فوت ہو گئے۔ حضرت محل نے بھی اسی طرح نیپال کے علاقے میں وفات پائی۔ آخری تاجدارِ مغلیہ بہادر شاہ ظفر رنگون میں جلاوطنی کی اذیتیں برداشت کرتے ہوئے رحلت پا گئے۔ ان کی وفات کے وقت صرف شہزادہ جواں بخت ان کی بیگم اور بچی، اور ملکہ زینت محل کے سوا کوئی بھی شریک نہ تھا۔

ممو خان۔ نانا راؤ اور خان بہادر خان کو راجہ نیپال کے سپہ سالار جنگ بہادر نے دھوکے سے برطانوی حدود میں لا کر گرفتار کرا دیا۔ اور انھیں بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ فیروز شاہ ہجرت کر کے اسلامی ممالک میں گھومتے پھرتے بمقام مکہ معظمہ ۱۸۷۷ء میں وفات پا گئے۔

ان سب جاں نثارانِ وطن اور شہیدانِ حریت کے کارنامے زندہ ہیں اور تاریخ کے روشن اوراق پر تا ابد تابندہ رہیں گے۔ گو انگریز فاتحین نے جنگِ آزادی کی تاریخ کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور مجاہدین کے عظیم کارناموں کو بدنامی کے داغوں سے مٹانے کی کوشش کرتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ جنگ محض غدر تھا یا سپاہیوں کی بغاوت؟ تو اس کا اثر ملک گیر کیوں تھا؟۔ جس طرح اس سے پہلے کئی فوجی چھاؤنیوں میں فساد ہوئے اور دبا دئے گئے۔ میرٹھ چھاؤنی کا ہنگامہ بھی اگر وقتی شورش کے تحت ہوتا تو اسی طرح دبا دیا جاتا۔ سارے ملک کے عوام دہلی کو مرکز مان کر اس میں شریک نہ ہوتے۔ اس لئے ثابت ہے کہ ایک سیاسی انقلابی تحریک کے زیر اثر عوامی جدوجہد

نے میرٹھ کے ہنگامے کو آغاز کا حیلہ بنالیا۔ اور ایک باقاعدہ تنظیم جو سارے ملک میں مدت سے جاری تھی ہر جگہ شعلے بھڑکا دئے۔ جس کا مقصد انقلاب اور غلامی سے نجات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دہلی کی شکست کے بعد بھی لکھنؤ اور ملک کے اطراف وجوانب میں یہ جنگ کسی نہ کسی پیمانے پر جاری رہی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد برطانوی حکومت نے اس عظیم جمہوری جدوجہد کو "غدر" اور "بغاوت" کے نام سے مشہور کیا۔ لیکن جو واقعات پیش کئے گئے ان کی حقیقت کی روشنی میں اب یہ کہنا ہمارے لئے دشوار نہیں کہ یہ سب حاکمانہ اقتدار اور جبر وظلم کا غلط پروپیگنڈا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی عوام میں بعض غلط فہمیاں بھی پھیلیں اور حکومت کے چند اصلاحی امور کو انھوں نے بیجا شک وشبہ کی نظر سے دیکھا۔

مثلاً ہندوؤں نے "ستی" اور بعض دوسری رسمی باتوں کی بندش کو محض کم فہمی کے سبب سے مذہبی مداخلت سمجھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے انگریزی تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ جان کر اس کی مخالفت کی۔ اسی طرح چربی کے کارتوسوں کا معاملہ بھی کسی حد تک خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اور ان کے ذریعے بیدینی کا خطرہ محض قیاس اور کم سمجھی کی بنا پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے کارتوسوں کے سلسلے میں زیادہ تر دیہاتی ہندو سپاہی بیتاب نظر آتے تھے۔ کیونکہ انھیں اپنے علاقائی خاندانوں کے طعنوں کا خوف تھا۔

آج عقل وعلم کی روشنی میں ان میں سے زیادہ تر باتیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ تعلیم سے نفرت اور مخالفت خواہ وہ کسی زبان کی ہو۔ کوئی ذی فہم انسان نہیں

کر سکتا۔ "ستی" کی رسم بجائے خود انسانیت کے خلاف رواج تھا جس کی بندش پر تعلیم یافتہ اصلاح پسند ہندو مطمئن اور مسرور تھے۔ لیکن کسی قوم کے رسم و رواج کو کسی غیر ملکی حکومت کی طرف اک دم حکماً بند کرنا بھی مصلحت کے خلاف تھا۔ اور رائے عامہ کی تربیت کے بغیر صدیوں کے رسوم اور طرزِ معاشرت و زبان میں جبریہ تبدیلی نامناسب فعل تھا جسے برِّصغیر ہند کے عوام فوری طور پر گوارا نہ کر سکے۔ اور چونکہ ان بندشوں کے ساتھ عیسائیت کی جبریہ اشاعت و تبلیغ بھی جاری رہی، نیز اقتصادی بدحالی عام ہوتی نظر آئی۔ اور حکومت نے رعایا کے آرام اور خوشی کا کوئی خیال نہ کیا۔ اس لئے عوام اس حکومت کو ظالم و جابر سمجھنے میں حق بجانب تھے

کمپنی کی حکومت جس کے خلاف عوامی ہند نے جہادِ آزادی کا علم بلند کیا شکست خوردہ نظر آئی کیونکہ یہ ثابت ہوگیا۔ کہ اس کی بدعنوانی جور و تشدد اور بغاوت کا سبب ہوئی۔

چنانچہ سرسید کی تشریح نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ انگریز حکام اپنی بدنظمیوں کے سبب ہندوستان پر حکومت کرنے میں ناکام رہے۔ اس سے ملکی عوام مختلف تکالیف کے علاوہ معاشی بدحالی میں بُری طرح مبتلا ہو گئے۔ اور کسی قوم کا ان صعوبتوں میں گرفتار ہو کر حکومت سے سرکشی و بغاوت کے لئے آمادہ ہو جانا اور اپنے اطمینان و سکون اور امن و عافیت کی خاطر آزادی کے لئے جدوجہد کرنا "غدر" نہیں بلکہ جائز "جہادِ حریت" ہے۔ اس جہاد کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہمارے ملک کے عوام کا سیاسی شعور پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا۔ اس لئے یہ انقلابی تحریک جو قطعاً جمہوری تحریک تھی صحیح طور پر منظم و مستحکم نہ ہو سکی اور جذبۂ صادقہ کی کمزوری

نے پھوٹ پیدا کر کے غیروں کو فتحیاب کر دیا۔ تاہم کمپنی کی حکومت کو خود حکومتِ برطانیہ نے ناکام قرار دیا۔ اس کا خاتمہ عمل میں لایا گیا اور برطانوی حکومت کا باضابطہ قیام ہوا۔

عوامی انقلاب زندہ

۱۸۵۷ء کی آگ نے حریت کا جو چراغ جلایا۔ اُسے جنگِ آزادی کے شہیدوں کے خون نے روشن رکھا۔ وہ اس وقت تک نہ بجھا جب تک آزادی کی صبح نمودار نہ ہو گئی۔ سیاسی شعور اور حریت کی جو چمک پیدا ہو چکی تھی نوّے سال تک وہ دلوں کو گرماتی رہی۔ اور بالآخر ان شعلوں نے ۱۹۴۷ء میں غیر ملکی حکومت کو اس برِ صغیر کی آزادی کا حق تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ انقلاب ہی کی برکت تھی جس کی بدولت اسلامیانِ ہند نے آزاد مملکتِ پاکستان کے حصول میں فتح پائی۔ اور آج یہ جمہوریۂ اسلامیہ دنیا کے نقشہ پر تاباں و درخشاں حقیقت بنا نظر آتا ہے۔

پاکستان پائندہ باد!